

Rs. 15/-

ملک کا جگہ

جنگل کی آواز

April 2008

موجودہ وقت میں میڈیا زینت نہیں ضرورت

میڈیا زینت نہیں ضرورت ہے

میڈیا تبلیغ کا ایک موثر پلیٹ فارم بن سکتا ہے،
اس سلسلے میں جام نور کے ہر تعاون کے لیے تیار ہوں
حضرت پروفیسر سید شاہ محمد امین میاں مارہروی
(سجود گنج، تانہ، مہاجر، پاکستان)

ملکی سطح کے میڈیا کا مقابلہ کرنے کے لیے
جام نور کے پاس ایک مضبوط اور اچھی ٹیم ہے
حضرت سید محمد شرف مارہروی (انگریز، کشمیر، بھارت)

غریب و ملت کے لئے میڈیا
نہایت ناگزیر بن گیا ہے
مولانا یونس اختر مصباحی (بانی دارالہدی)

آج مسلم میڈیا کی ضرورت زیادہ ہو گئی ہے
مفتی کرم احمد نقشبندی (شاہی ماہر، مہاجر، بھارت)

موجودہ وقت میں میڈیا ہماری
زینت نہیں ایک اہم ضرورت ہے
ڈاکٹر سید سلیم اشرف جاسی (سجود گنج، تانہ، مہاجر، پاکستان)

میڈیا کا جواب ہم جذبات سے
نہیں بلکہ غور و فکر کے ساتھ دیں
اسد الدین اویسی (مہاجر، پاکستان)

میڈیا کی وجہ سے آج پوری دنیا
کمرشل ورلڈ میں تبدیل ہو گئی ہے
پروفیسر شافع قدوائی (سجود گنج، تانہ، مہاجر، پاکستان)

ماہنامہ جام نور بھارتی کے زیر اہتمام
نیشنل میڈیا کنونشن

۹ مارچ ۲۰۰۸ء کو

کامیابی کے ساتھ اختتام پزیر

نوت
میڈیا کنونشن کی تفصیلی رپورٹ اگلے شمارے (مئی) میں ملاحظہ فرمائیں



شعرات

جام نور کلکتہ کی فائل سے چند بصیرت افروز تحریریں

روحانی انقلاب کا موسم:۔ ربیع الاول کا مہینہ اس موسم کی یاد دلاتا ہے جب کہ خاکدان گیتی کے اجڑے ہوئے چمن میں بہار آئی۔ قلب و روح کی توانائیوں کا چشمہ پھوٹا اور فاران کے افق سے خورشید رسالت کی وہ کرن چمکی جس کی روشنی سے گیتی کے ذرے ذرے پر سحر کا جلال پھیل گیا۔ فراز عرش سے اترنے والے مسیحا کی آواز نے ہستی کی ڈوبتی ہوئی نبض میں حیات کی نئی تپش پیدا کی، اور دائمی ہلاکتوں کے دہانے پر کھڑے ہونے والے انسانوں کو دل جیتنے والے پیغام کے ذریعہ بربادیوں کے ہولناک انجام سے بچالیا۔ سلام ہو اس روح مقدس پر جس نے دنیا میں مسلم نام کی ایک نئی قوم کو وجود بخشا اور اسے خاک مذلت کی پستیوں سے اٹھا کر عظمتوں کے اوج ثریا پر پہنچا دیا۔ درود ہو اس سلطان کو نین پر جس کے سحر انشیں غلاموں نے قوموں کی تقدیر بدل دی اور تکبیر کی صداؤں سے اقطار ارض میں سہلکے ڈال دیا، جن کی خارا شگاف تلواریں نے دنیا کی مغرور طاقتوں کے پراسٹھ اڑا دیے اور انہیں سطوت حق کے سامنے سرنگوں ہونے پر مجبور کر دیا۔ رحمت و نور کی موسلا دھار بارش ہو اس قصر معلیٰ پر جس کا سبز گنبد دنیا کے نوے کروڑ مسلمانوں کی امیدوں کا مرکز ہے، اور جس کے سائے میں فرماوے کو نین کی وہ جلوہ گاہ ناز ہے جس کے صرف تصور سے عشاق کے دلوں میں کیف و سرور کا جلال رہتا ہے۔ خراج عقیدت نچھاور ہو اس خسروئے کائنات کی چوکھٹ پر جہاں آٹھوں پہر امیدوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے اور دامن پھیلانے والے رحمتوں کی خیرات سے نہال ہو جاتے ہیں اور جہاں کی اڑتی ہوئی خاک کو نین کے سرفراز چہروں کے لیے غارۂ جمال و زیبائی ہے۔ عشق و ایمان کی تھمیں ہو اس پیکر رحمت کی جناب میں، جس کی نظر کا ایک اشارہ گنہگاروں کے دھڑکتے ہوئے دلوں کا قرار ہے اور جس نے اقلیم محبت کے خاک نشینوں کو چشم زدن میں عظمتوں کے اوج کمال پر پہنچا دیا ہے۔ آج بھی جس کے دامن کی چارہ گری آشفۃ حالوں کی تسکین کا قیمتی سرمایہ ہے۔ خدا سلامت رکھے اس جذبہ غلامی کو، جس نشے سے محو ہو کر ہم گنبد خضرا کے شہر یار کو اپنا آقا کہتے ہیں اور ہمارے دل کی دنیا جھوم اٹھتی ہے۔ یہی جذبہ جب تک سلامت تھا دنیا کی سروری ہمارے قدموں کی ٹھوک میں تھی اور ہم میر کارواں کہلاتے تھے۔ اور جب سے عقیدہ و فکر کے الحاد نے حب رسول کا انشیں تاراج کر دیا اور سرور مختبی کی عظمت خدا داد سے انحراف کی جسارت پیدا ہوئی قدرت نے ہمارے ہاتھوں سے اپنا بخشا ہوا اعزاز چھین لیا۔ پہلے ہمارا جہاں نقش قدم تھا اب وہاں مانتھائیں کی بھی جگہ نہیں مل رہی ہے۔ خدائے قدیر اپنے محبوب کے صدقے میں اپنی رحمتوں کا اعزاز ہمیں واپس کر دے اور پھر ایک بار ہم اسلام کا پرچم کائنات گیتی کے بحر و بر پر لہرائیں۔ ندی کا بہاؤ پیچھم ہی کی طرف بھاگتا جا رہا ہے۔ ندی کا پانی اس وقت تین میل دور ہٹ گیا ہے۔ اب تو سیلاب کے ہاتھوں بے دخل ہو جانے والی ہماری زمینیں بھی ہمیں واپس مل گئی ہیں۔ کبھی ہماری سرحدوں میں ندی کا پانی گھس آتا تھا۔ اب ہم ندی کی سرحدوں میں گھس کر نہایت عافیت کے ساتھ کھیتی باڑی کرتے ہیں اور پہلے سے زیادہ خوشحال ہو گئے۔ اس جواب پر مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی اس لیے کہ میں نے کھلی آنکھوں سے مادی طاقتوں کو درویش کے سامنے ہتھیار ڈالتے دیکھا ہے۔ البتہ اس واقعہ سے دل کا یقین تازہ ہو گیا۔

(ماہنامہ جام نور کلکتہ، جولائی ۱۹۶۷ء)

زندہ باداے عشق اے سوداے ما اے طیب جملہ علتہاے ما

یورپ اسلام کے دروازے پر: یورپ کو اسلام کے دروازے پر کھڑا کرنے کی کہانی بھی کچھ اسی طرح کی ہے۔ اس کا پورا قصہ یوں ہے کہ ۱۹۸۳ء میں اپنے دوستوں کی دعوت پر میں ہالینڈ گیا۔ میرے لیے بہت آسان تھا کہ دو چار تقریریں کر کے اور اپنے معتقدین کا ایک محفوظ حلقہ بنا کر میں واپس لوٹ آتا۔ لیکن میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ یورپ میں عیسائی مذہب کا زوال شروع ہو گیا ہے۔ یورپین اقوام کی نئی نسل عیسائی مذہب سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ ان کے چرچ ویران ہو رہے ہیں، ان کی مذہبی درس گاہوں میں گرداڑ رہی ہے۔ ہر چیز کو عقل کے ترازو پر تولنے والے اب اپنے مذہب کو بھی عقل کے ترازو پر تول رہے ہیں۔ عیسائی مذہب کا یہ بنیادی عقیدہ ان کے حلق کے نیچے کسی طرح نہیں اتر رہا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سو لی پر چڑھ کر سارے انسانوں کے گناہوں کا کفارہ بن گئے۔ اب ہر انسان کو پوری آزادی ہے کہ وہ بڑے سے بڑا گناہ

کرے، سخت سے سخت جرائم کا ارتکاب کرے، جس طرح چاہے دنیا میں ظلم اور فساد پھیلائے، خدا کے یہاں اس کی کوئی پکڑ نہیں ہوگی۔ اس طرح اس عقیدے کی معقولیت کو بھی اس کی عقل نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے کہ کلیسا کے پادری کے سامنے کوئی شخص اپنے گناہوں کی فہرست پیش کر کے اس سے اپنے گناہ معاف کرائے تو خدا کے یہاں بھی اسے معافی مل جائے گی۔ اسی طرح عیسائی مذہب کی نوجوان نسل کے لیے یہ عقیدہ بھی ناقابل قبول ہو گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ باپ بیٹے کا رشتہ بغیر بیوی کے کیوں کرو جود میں آسکتا ہے؟ عقل کی روشنی میں عیسائی مذہب کی بنیاد اب یورپ میں متزلزل ہوتی جا رہی ہے۔

اب یورپ کی سرزمین اسلام کی دعوت کے لیے سازگار ہوتی جا رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کی مادری زبانوں میں اسلام کی دعوت ان تک پہنچائی جائے۔ اور اس کام کے لیے سب سے پہلے ایسے داعیوں کا دستہ تیار کرنا ہوگا جو اسلام کی تعلیمات سے بھی واقف ہوں اور یورپ کے اقوام کی مادری زبانوں پر بھی عبور رکھتے ہوں۔ یہی سوچ کر میں نے ۱۹۸۳ء کے سفر میں جامعہ مدینۃ الاسلام کے نام سے دینی تعلیمات کا ایک عظیم مرکز ہالینڈ کی راجدھانی ہیگ میں قائم کیا اور اس کے لیے ایک تین منزلہ عمارت بھی خرید کر میں نے اس میں باضابطہ تعلیم کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ ابتدا میں ہمیں پارٹ ٹائم طلبہ ملے جو سرکاری اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے تھے، چھٹی کے بعد شام کو وہ دو گھنٹے کے لیے جامعہ کے کلاس میں شریک ہوتے تھے۔ اردو اور ناظرہ قرآن کے درس کے ساتھ ساتھ ہم نے انہیں اسلام کی مذہبی اور اخلاقی تعلیمات سے روشناس کرانے کے ٹیچر کا سسٹم اختیار کیا جو ہر دن تیس منٹ تک جاری رہتا تھا۔ تعلیم کے ساتھ ان طلبہ کو ایک ترجمان کے ذریعہ ”اسلام انسان کا فطری مذہب ہے“ کے عنوان پر ڈیج زبان میں تقریروں کی مشق شروع کرائی۔ خدا کا شکر ہے کہ چند ہی دنوں میں اس موضوع پر نہایت موثر اور سلیج ہوئی تقریر کرنے والوں کی ایک اچھی خاصی ٹیم تیار ہو گئی۔ اس کے بعد ہم نے ایک بہت بڑے جلسے کا انعقاد کیا۔ اس جلسہ کی خصوصیت یہ تھی کہ جو طلبہ اس جلسہ کے مقرر تھے وہی اس کے منتظم بھی تھے، سامعین سے پورا ہال کچھ کچھ بھر ہوا تھا۔ تین گھنٹے تک پندرہ طلبہ کی اتنی اثر انگیز اور جاندار تقریریں ہوئیں کہ لوگ محو حیرت رہ گئے۔ وہاں کے لوگوں پر اس کا اتنا گہرا اثر پڑا کہ چند ہی دنوں میں ملک کے طول و عرض سے طلبہ کی اتنی زبردست بھیڑ جمع ہو گئی کہ جامعہ کی عمارت تنگ ہو گئی۔

اس جلسہ کی برکت کہنے کے اس کے بعد فل ٹائم طلبہ بھی ہمیں مل گئے جو قیام و طعام کی سہولت کے ساتھ تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کی خواہش کے مطابق جامعہ کی عمارت میں ایک ہوٹل کا قیام ہمیں عمل میں لانا پڑا۔ اس کے بعد نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کا پورا نقشہ مرتب کر کے ہم نے جامعہ کی ٹینٹنگ کمپنی کے حوالے کر دیا۔ اس طرح نو مہینے کی مدت میں دینی تعلیم کا ایک نہایت مضبوط مرکز قائم کر کے ہم اپنے وطن واپس لوٹ آئے۔ ہمیں یقین ہے کہ جس دن یورپ کے ملکوں میں فریج، انگش، جرمنی اور ڈیج زبان جاننے والے علما اسلام کی دعوت کی مہم شروع کریں گے وہ اسلام کی فتح و کامرانی کا نہایت درخشاں دن ہوگا۔ (ماہنامہ رفاقت، پٹنہ، مارچ ۱۹۸۹ء)

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر:- انسان کی زندگی بھی کتنے متضاد حالات کا مجموعہ ہوتی ہے، اس کا تجربہ ان لوگوں کو خاص طور پر ہوگا جو عوامی زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں، پردہ غیب کی چارہ گری شریک حال نہ ہو تو آدمی پاگل ہو جائے گا۔ ”جام نور“ کی پہلی کاپی جب پریس جا رہی تھی تو ماحول پر مشکلات کا اتنا گھنا اندھیرا تھا کہ قدم رکھنے کے لیے کوئی صاف جگہ نظر نہیں آ رہی تھی جو امر سب سے زیادہ پریشان کن تھا وہ موانع کے ہجوم میں اپنی تنہائی کا احساس تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب میں تنہا نہیں ہوں۔ چند قابل اعتماد دوستوں کی رفاقت نے میرا حوصلہ بہت بلند کر دیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ذہنی اخلاص اور باہمی تعاون کا یہ حلقہ وسیع ہوتا جائے گا۔ امیر کشور خطابت سبحان الہند حضرت مولانا ابوالوفا صاحب فصیحی غازی پوری نے قلمی رفاقت کے لیے ادارت خصوصی کا منصب قبول کر لیا ہے موصوف کے کئی رشحات قلم منظر عام پر آچکنے کے بعد اب یہ امر صیغہ راز میں نہیں رہ گیا ہے کہ زبان کے ساتھ قلم کا سحر بھی قدرت نے انہیں عطا کیا ہے۔

اپنے تبلیغی دوروں میں مولانا موصوف نے ”جام نور“ کی توسیع اشاعت کے لیے کافی یقین دلایا ہے علاوہ ازیں رئیس الملتہ جناب صوفی شاہ قربان علی صاحب تنبیہ جنہوں نے کلکتہ کی سرزمین پر معراج کافر نس اور سنی جمیۃ العلماء کافر نس کی کامیابی میں نمایاں حصہ لے کر بنگال کی سنی دنیا میں ایک اہم جگہ حاصل کر لی ہے، وہ بھی اپنی تمام صلاحیتوں اور جملہ وسائل و ذرائع کے ساتھ ”جام نور“ کی رفاقت کے لیے کھڑے ہو گئے ہیں۔

جام نور کے مستقبل کے بارے میں موصوف کے بلند حوصلوں کی تفصیل معلوم کر کے بیساختہ دل سے دعا نکلتی ہے کہ خدا انہیں جلد تکمیل کو پہنچائے۔ پھر علمائے کرام، ائمہ مساجد اور ہر حلقے سے نمکسار دوستوں کے پیشتر پیغامات موصول ہو رہے ہیں کہ اب کسی قیمت پر بھی ”جام نور“ کو مشکلات سے دوچار ہونے نہیں دیا جائے گا ”سیاست جدید“ کانپور کے ایڈیٹر حضرت مولانا اسحاق علی صاحب بھی جام نور کی توسیع اشاعت میں نمایاں حصہ لے رہے ہیں مولیٰ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے، ادارہ اس سلسلہ میں ان کا نہایت مشکور ہے۔ (ماہنامہ جام نور کلکتہ، مارچ ۱۹۶۷ء)

وقت کی بنیادی ضرورت:۔ جس ضرورت کے احساس نے میری زندگی کو صحافتی دور میں داخل کیا ہے اس کے متعلق ذیل کی چند سطریں غور سے پڑھیے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستان میں ہر جگہ اہل سنت و جماعت کی عظیم اکثریت ہے اس کا اندازہ ان مذہبی اور روحانی تقریب سے ہوتا ہے جو یکساں طور پر ہندوستان کے سارے طول و عرض میں منائی جاتی ہیں۔ جب کہ اہل سنت کے علاوہ کوئی فرقہ انہیں اپنی مذہبی تقریب قرار نہیں دیتا۔ لیکن ہم تعداد کے اعتبار سے اکثریت میں ہوتے ہوئے بھی اپنے اثر کے لحاظ سے قطعاً اقلیت میں ہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اب تک ہم اپنے قرار واقعی وجود کا یقین ہی نہیں دلا سکے ہیں۔ دنیا کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ہمارے یہاں تین چار متوازی جماعتوں کی تنظیم ہے۔ پھر بھی ہم منظم نہیں ہیں۔ ہر جماعت کی ناکامی کے بعد ایک نئی جماعت اس امید کے ساتھ وجود میں لائی گئی کہ شاید اس کے ذریعہ ہمارا خواب شرمندہ تکمیل ہو جائے، لیکن وہ بھی کچھ دنوں کے بعد اپنے پیش رووں سے جا ملی۔

اس خطرناک اور نتائج آزمودہ اقدام کے لیے میں ہرگز رائے نہیں دوں گا کہ اپنے جماعتی مسائل سے نمٹنے کے لیے اب کوئی پانچویں جماعت بنائی جائے آج کی صحبت میں صرف اپنی ناکامی کے اسباب کا تجزیہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے یہاں کچھ ایسی چیزوں کا ضرور فقدان ہے جو کسی بھی جماعتی تنظیم کے لیے ناگزیر ہیں مثال کے طور پر ہم ملک میں ذہنی اعتبار سے کارکنوں کا کوئی دستہ تیار کیے بغیر کل ہند سطح پر اپنی جماعتوں کے پروگرام کا اعلان کر دیتے ہیں۔ ہمارے یہاں صرف مذہبی اعتقاد کی سبجکتی کسی بھی دستوری جماعت کا بوجھ اٹھانے کے لیے کافی ہے حالانکہ مذہبی خیالات کی یگانگت اور کسی تنظیمی جماعت کے اغراض سے اتفاق، دونوں میں نہایت واضح فرق ہے۔ کسی بھی جماعتی تنظیم کو بروئے کار لانے کے لیے جب تک افراد کے درمیان نظام جماعت کے ساتھ ذہنی ارتباط، جذباتی لگن، والہانہ آمادگی باطنی اخلاص اور قربانیوں کی سچی تڑپ موجود نہ ہو، عوامی سطح پر کسی مضبوط قیادت کی نمود اور بکھرے ہوئے شیرازوں کی یکجائی ناممکن ہے۔ جب تک کہ ہم دلشیں اور پرکشش لٹریچر کے ذریعہ اپنی نوجوانوں کا ذہن، جماعتی مزاج کے سانچے میں نہیں ڈھال لیتے ہماری کوئی تنظیم قابل ذکر کردار کے قابل نہیں ہو سکے گی۔ صحیح العقیدہ حلقوں نے ہماری حوصلہ افزائی کی تو انشاء اللہ تعالیٰ جلد ہی ہم ایک بے داغ اور نکھر اواہل اثر پیر جماعت کے حوالہ کریں گے۔ (ماہنامہ جام نور کلکتہ، مارچ ۱۹۶۷ء)

بقیہ تحریک اہل سنت: اوشا سانیال کی نظر میں — مقالہ نگار ڈاکٹر سانیال ایک غیر مسلم اسکالر ہیں۔ انہوں نے دستیاب مآخذ اور مراجع کی روشنی میں اپنی تحقیق پیش کی ہے۔ اس میں چند وہ باتیں بھی ہیں جن سے اختلاف کی گنجائش ہے۔ مگر ایک غیر جانبدار کی اس تحقیق نے ”تحریک اہل سنت و جماعت“ کے سلسلے میں پھیلائی گئی بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا ہے۔ مثلاً یہ کہا جاتا تھا کہ یہ ایک فرقہ ہے جس کے بانی مولانا احمد رضا تھے۔ یہ تحریک رسوم و روایات سے بندھی ہوئی ہے۔ اصلاح اور تجدید کے میدان میں ان کو شمار نہیں کیا جاتا تھا یا کچھ حضرات اس کو شمار کرنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ تحریک دیہاتوں میں مرکوز تھی۔ تعلیمی اور تنظیمی امور سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اس تحریک سے وابستہ افراد دوسرے ہندوستانی مسلمانوں کی تکفیر کرتے تھے۔ تحریک خلافت اور ترک موالات کی انہوں نے ذاتی وجوہات کی وجہ سے مخالفت کی تھی۔ مگر اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارے پروپیگنڈے تھے جن کی تاریخ میں کوئی بنیاد نہیں تھی۔ یہ الزامات تھے جن کی بنیاد میں حقیقت نہیں بلکہ خود ساختہ افسانہ تھا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کے قائد اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی ہر معاملے کو شرعی اصولوں کی روشنی میں دیکھتے تھے۔ اور اپنے موقف کی تائید میں قرآن، حدیث، اجماع، قیاس اور اقوال علماء سے دلائل بھی فراہم کرتے تھے۔ اب اگر کوئی شرعی اصولوں کی زد میں آتا تھا تو اس میں خود اس کا قصور تھا نہ کہ شرعی فیصلہ بتانے والے کا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق جاننے اور حق بولنے کی توفیق عطا فرمائے۔ □□□

قصہ منقرضات حقیقت یا افسانہ؟

گئے، اک باضمیر شخص جس کے قریب بھی جانے کی جسارت نہیں کر سکتا، انہیں من گڑھت افسانوں کی ایک کڑی ”قصہ غرائق“ بھی ہے جسے آئندہ سطور میں ہم بعون اللہ سیر و قسطا کرنے کی کوشش کریں گے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری شریف میں رئیس المفسرین حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی یہ حدیث ذکر فرمایا: (ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد بالنجم ومسجد معہ المسلمون والمشرکون والجن والانس) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ نجم کی آیت سجدہ پر سجدہ فرمایا تو آپ کے ساتھ مسلمانوں، مشرکوں، جنوں اور انسانوں سب نے سجدہ کیا۔

آئندہ سطور میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس سادہ سی بات کو مستشرقین نے کس طرح سے باطل کو حق کا لبادہ اوڑھا کر، رائی کا پہاڑ بنا کے پرستاران حق و صداقت کو گمراہ کیا ہے۔ فقط اتنی سی بات کو لے کر مستشرقین نے اک ایسا افسانہ گڑھ ڈالا کہ خباثت کی اس انتہا کو کسی بھی سلیم الفطرت انسان کے ذہن کی رسائی ممکن نہیں تھی۔

مستشرقین نے حدیث مذکور کے درود کا پس منظر بایں طور بیان کیا ہے کہ ایک روز حرم مقدس میں رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کفار و مشرکین کے مابین سورہ نجم کی تلاوت فرما رہے تھے جب اس آیت کریمہ پر پہنچے: (افریتم السلات والعزی ومنات الثالثۃ الاخری) تو نعوذ باللہ شیطان نے آپ کی زبان مبارک پر یہ کلمات جاری کر دیے: (تسلک الغرائق العلی وان شفاعتھن لشر تسعی) یعنی یہ صنم مرغان بلند پرواز ہیں اور ان کی شفاعت کی امید کی جاسکتی ہے۔ زبان رسالت مآب سے یہ کلمات سن کر مشرکین مکہ از حد خوش ہوئے اور آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہنے لگے کہ وہ اپنے قدیم مذہب کی جانب پلٹ آئے ہیں، اب آج سے ہمارے اور ان کے درمیان کوئی عداوت نہیں۔ بعدہ حضور ﷺ نے سورہ نجم کی سجدہ والی آیات پڑھیں تو رسول اکرم کے ساتھ کفار و مشرکین

مذہب اسلام کے حقانیت کی سب سے واضح اور بین دلیل یہ ہے کہ مشرکین و مستشرقین، یہود و نصاریٰ کے چودہ سو سالہ مادی و فکری مسلسل حملوں اور یلغار کے باوجود بفضل خدا آج بھی زندہ و تائیدہ ہے۔ دشمنان اسلام نے وہ کونسا حربہ ہے جسے اسلام کے خلاف استعمال نہ کیا؟ عداوت اسلام میں عصر حاضر کے مستشرقین ماضی کے مشرکین پر بھی سبقت لے گئے، انہوں نے اپنے ترش کش کاہر تیر و جود اسلام کو چھلنی کرنے کے لیے نشانے پر لگانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن نصرت خداوندی ہمہ وقت و حال بن کر اسلام کی حفاظت و نگہبانی کرتی رہی۔ جب مستشرقین کو صلیبی جنگوں میں مسلسل شکست کے بعد اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا کہ اس جنگجو قوم سے ہم مادی لڑائی میں کبھی بھی جیت نہیں سکتے تب انہوں نے حرب کی نوعیت تبدیل کر دی، اب بجائے مادی جنگ کے انہوں نے فکری اور ثقافتی جنگ چھیڑ دی، اب بجائے مسلمانوں کے جسم پر وار کرنے کے انہوں نے دل و دماغ پر یلغار کرنا شروع کر دیا، اور جب پیروان اسلام کی جانب سے کوئی خاطر خواہ مزاحمت ابھر کر سامنے نہ آئی، تو اس پر بھی حملہ آور ہونا شروع ہو گئے جو کہ اک مومن کے لیے اس کی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے اس کا عقیدہ، اس کا ایمان، اسی پر بس نہیں مزید برآں جب ایمان و عقیدہ پر حملہ سے بھی جی نہ بھرا تو جان ایمان، رسول انس و جان پر بھی یلغار کی ناپاک جسارت کی، تا کہ اسلام کے اپنی قلعہ میں نقب لگائیں، چونکہ مستشرقین اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ رسول گرامی وقار صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعدار روزگار شخصیت ہی اسلام کے وجود میں روح رواں کی حیثیت رکھتی ہے لہذا اگر وہ ان کی شخصیت و وقار کو مجروح کرنے میں کامیاب ہو گئے تو بنیاد اسلام از خود ہی متزلزل ہو جائے گی، اسی ہدف کی تکمیل کے لیے انہوں نے رسول ہاشمی روحی فدائے صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات با برکات کے تعلق سے طرح طرح کے افسانے گڑھے اور ان افسانوں کے گڑھنے میں کذب و افتراء اور بہتان طرازی کی وہ تمام حدود پار کر

روانہ ہوا، تین ماہ کا عرصہ انہوں نے حبشہ میں بڑے ہی امن وامان کیساتھ گزارا، ایک روز انھیں خبر ملی کہ مشرکین مکہ کے اسلام قبول کر لیا ہے اب وہاں ماحول اور حالات پر امن ہیں، کسی کافر کی مجال نہیں کہ اب فرزندان اسلام کو گزند و تکلیف پہنچا سکے، لہذا مہاجرین نے آپس میں صلاح و مشورہ کیا کہ جس ظلم و جبر کے خوف سے ہم اپنا وطن عزیز اور گھر بار چھوڑ کر آئے تھے، اب بلفعلہ تعالیٰ دور ہو گیا ہے، اس لیے اب ہمیں اپنے وطن لوٹ جانا چاہیے، لیکن بعض صحابہ کرام نے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا کہ ابھی کوئی پختہ اور قابل اعتماد خبر نہیں ملی ہے اس لیے غلطی میں واپسی کا فیصلہ کرنا خلاف دانشمندی ہے، جب تک رسول اللہ کا کوئی نامہ نہ آجائے ہمیں اس وقت تک صبر و انتظار کرنا چاہیے لیکن جذبہ حب وطن صبر و ضبط پر غالب آ گیا اور صحابہ کرام مکہ مکرمہ واپس لوٹ آئے، مگر خلاف توقع انہوں نے مکہ کے حالات حسب سابق ناسازگار پایا۔

غور فرمایا آپ نے کہ مستشرقین نے مہاجرین حبشہ کی مکہ واپسی کو حدیث مذکور کے ساتھ کس خوب صورتی کے ساتھ ضم کیا ہے! انھیں یہ لگتے ہوئے غیر متآئی کہ شیطان نے دوران تلاوت کچھ ایسے الفاظ حضور کی زبان سے نکلوا دیے جن میں بتوں کی تعریف و مدح سرائی کی گئی تھی اور بتوں کی شفاعت کے عقیدے کو تسلیم کیا گیا تھا، حضور کے رویے میں اس تغیر و تبدیلی سے کفار مکہ از حد خوش ہوئے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مل کر سجدہ کیا، لہذا اس امر کی اطلاع جب مہاجرین حبشہ کو ملی تو وہ لوگ مکہ مکرمہ لوٹ آئے۔ مگر جب سید الملائکہ حضرت جبریل امین نے حضور کو شیطان ملعون کی اس حرکت سے آگاہ کیا تو آپ بے حد رنجیدہ و ملول ہوئے، نتیجہ رب کریم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسکین خاطر کی خاطر سورہ حج کی آیت نمبر ۵۲ نازل فرمائی۔

دیکھا آپ نے مستشرقین نے کس چالاک کے ساتھ ایک کڑی کو دوسری سے جوڑ کر کذب و افتراء پر مبنی اک حسین افسانہ گڑھا ہے، یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ جیسے بلند پایہ محدث بھی اس من گڑھت افسانے کی تصدیق کر بیٹھے۔ لیکن کافذ کی ناؤ زیادہ دیر تک نہیں تیر سکتی، اس لیے کہ حق ہمیشہ غالب ہوتا ہے مغلوب نہیں۔ لہذا آنے والے صفحات میں ان شاء اللہ آپ دیکھیں گے کہ اس خود ساختہ کہانی کی کس طرح پراچھے اڑاے گئے ہیں، براہین قاطعہ اور دلائل

نے بھی سجدہ کیا۔ بعد ازاں جبریل امین بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور کہا میں نے یہ سورت آپ کو اس طرح وحی نہیں کی تھی جس طرح آپ نے تلاوت کی ہے۔ یہ جان کر نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم بے حد افسردہ و کئیدہ خاطر ہوئے، تو رب کریم نے اپنے حبیب پاک کے اطمینان قلب کے لیے سورہ حج کی یہ آیت نازل فرمائی: (وَمَا ارسلنا من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطن فی امنیته، فینسخ اللہ ما یلقى الشیطن ثم یمحکم اللہ آیتہ، واللہ علیم حکیم) اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول اور نہ کوئی نبی مگر اس کے ساتھ یہ ہوا کہ جب اس نے کچھ پڑھا تو ڈال دیے شیطان نے اس کے پڑھنے میں (شکوہ) پس مٹا دیتا ہے اللہ تعالیٰ جو دخل اندازی شیطان کرتا ہے پھر پختہ کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی آیتوں کو اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بہت دانا ہے (الحج ۵۲)۔

یہ مفہوم متعدد دوسری آیات میں بھی بیان فرمایا گیا ہے علی سبیل المثال: (و کذلک جعلنا لکل نبی عدا و شیاطین الانس والجن یوحی بعضهم الی بعض زخرف القول غرورا) اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے سرکش انسانوں اور جنوں کو دشمن بنادیا اور وہ لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے ایسی باتیں سکھاتے ہیں جو بظاہر بڑی دلکش ہوتی ہیں (الانعام ۱۱۲)۔

مذکورہ بالا دونوں آیات میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی پاک کو باخبر فرما رہا ہے کہ آپ سے قبل ہم نے جتنے بھی انبیاء اور رسل مبعوث فرمائے ان کے ساتھ یہ معاملہ ہوا کہ جب انہوں نے ہماری آیتیں لوگوں کو پڑھ کر سنائیں تو شیطان نے ان کے دلوں میں ان آیات کے متعلق متعدد قسم کے شکوک و شبہات پیدا کر دیے، بجائے اس کے کہ وہ ان آیات کو قبول کرتے اس کے برعکس ان کے خلاف محاذ قائم کر لیا اور اعتراضات کی بوچھاڑ شروع کر دی۔

اسی پر اکتفا نہیں بلکہ مستشرقین نے اس واقعہ کو ایک کڑی بنا کر دوسرے واقعہ سے جوڑا اور ایسی کہانی تخلیق کی جسے پڑھ کر کم علم تو اپنی جا رہے ذی علم بھی ان کے دام مکر و فریب میں پھنس گئے اور کذب و افتراء پر ایمان لا بیٹھے۔ مستشرقین کی عیاری ملاحظہ کیجیے کہ اس حکایت کو انہوں نے دوسرے واقعہ کے ساتھ کس طرح مربوط کیا ہے۔

ماہ رجب بعثت کے پانچویں سال مہاجرین کا پہلا کارواں حبشہ

ساطع کی روشنی میں کس طرح اس کی دھجیاں بکھیری گئی ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب ہم مذکورہ افسانے کو مندرجہ ذیل زاویوں سے پرکھ کر اس کی حقیقت کو بعون اللہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے:

☆ کیا شیطان کو بارگاہ رب العزت سے اس قدر اختیارات حاصل ہیں کہ وہ انسانوں کو کسی فعل کے کرنے پر مجبور کر سکے؟

☆ کیا زبان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے بحیثیت رسول ان کلمات کی ادائیگی ممکن ہے؟

☆ جن مختلف واقعات کو بیان کر کے یہ افسانہ لڑھا گیا ہے کیا ان کی تاریخی حیثیت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ انھیں ایک واقعہ کی مختلف کڑیاں قرار دیا جاسکے؟

☆ کیا اس روایت کی سند و متن میں موجودہ نقائص کے باوجود اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟

☆ علمائے محققین کی اس افسانے کے متعلق آراء کیا ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے شیطان کو نسل انسانی کے لیے ایک امتحان تو بنایا ہے لیکن رب قدیر نے شیطان کو انسانوں پر مسلط نہیں فرمایا کہ وہ جس طرح چاہے انہیں انگلیوں کے اشارے پر نچائے اور انسان اس کے مقابلے میں عاجز و قاصر ہے کچھ نہ کر سکے۔ قرآن کریم کی بے شمار آیات نے بڑی ہی وضاحت کے ساتھ شیطان کی طاقت و قوت کی حقیقت کو آشکارا کیا ہے: (وَمَا كَانَ لَهُ عَلَيْهِمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا لَنَعْلَمَ مِنْ يَوْمٍ مِّنْ بَالَا حَرَّةٍ مِّنْهُ هُوَ مَنَافِي شُكٍّ، وَرَبِّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ حَافِظٌ) اور نہیں حاصل تھا شیطان کو ان پر ایسا قابو (کہ وہ بے بس ہوں) مگر یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ دکھانا چاہتے ہیں کہ کون آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور کون اس کے متعلق شک میں مبتلا ہے۔ اور (اے حبیب!) آپ کا رب ہر چیز پر نگہبان ہے۔ (سورہ ساء ۲۱)

دوسری آیت کریمہ میں شیطان نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ جو حضرات شیطان کے دام فریب میں پھنس کر اس کے اشارے پر زندگی بسر کرتے رہے بردمشر عذاب خداوندی کے مستحق ہو گئے، اور شیطان انہیں مخاطب کر کے کہے گا: (وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْهِمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتَكُمْ فَأَسْتَجِبْتُمْ لِي، فَلَا تَلُمُونِي وَلِلْمَوْتِ أَنْفُسُكُمْ) اور نہیں تھا میرا تم پر کچھ زور مگر یہ کہ میں نے تم کو (کفر) کی دعوت دی اور تم نے (فورا) قبول کر لی میری دعوت۔ لہذا تم مجھے

ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔ (سورہ ابراہیم ۲۲)

ان دونوں آیات کریمہ کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان ملعون کو کوئی ایسا اختیار ہرگز نہیں عطا فرمایا کہ وہ بالجبر کسی انسان کو پکڑ کر ضلالت و گمراہی کے گڑھے میں ڈال دے۔ انسان شیطان کے زرخے میں اس وقت آتا ہے جب وہ اللہ و رسول کے فرمودات سے روگردانی کرتا ہے۔ اس کے برخلاف جو لوگ اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہیں ان کے بارے میں قرآن نے فرمایا ہے کہ ایسے بندوں پر شیطان کا کوئی بس نہیں چلتا، رب قدیر کا ارشاد گرامی ہے: (إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ) یقیناً اس کا زور نہیں چلتا ان لوگوں پر جو (سچے دل سے) ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر کامل بھروسہ رکھتے ہیں۔ (آفل ۹۹)۔ اور اس حقیقت کا اقرار خود شیطان نے بھی قرآن حکیم کے ان الفاظ میں کیا ہے: (قَالَ رَبِّمَا اغْوِیْتَنِی لَا زِیْنَتَی فِی الْاَرْضِ وَلَا غَیْبَتِهِمْ اِجْمَعِیْنِ، اَلَا عِبَادُکَ مِنْهُمْ الْمُخْلِصِیْنَ) وہ بولا: اے رب! اس وجہ سے کہ تو نے مجھے بھٹکا دیا میں (برے کاموں کو) ضرور خوشنما بنا دوں گا ان کے لیے زمین میں اور میں ضرور گمراہ کروں گا ان سب کو سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں ان میں سے چن لیا گیا ہے۔ (سورہ الحجر ۳۹، ۴۰)

قرآن عظیم کی مندرجہ بالا آیات وضاحت کر رہی ہیں کہ اللہ کے وہ بندے جن کے سینوں میں شمع ایمان روشن ہے اور جو ذات وحدہ لا شریک پر اعتماد رکھتے ہیں، شیطان ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ شیطان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی تو اپنی جا، ان کے سائے سے بھی بھاگتا تھا، جس راستے سے آپ گزر رہے ہوتے تھے شیطان وہ راستہ چھوڑ دیتا تھا۔

اس تفصیل کے بعد کیا عقل سلیم اس بات کو تسلیم کر سکتی ہے کہ جب شیطان ان بندوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا جو ایمان، خلوص اور توکل کی صفات جمیدہ سے متصف ہیں، تو بھلا شیطان ان نفوس قدسیہ پر کیسے غالب آسکتا ہے جن کی بعثت اور آمد کا ہدف ہی خلق خدا کو شیطان کے مکر و فریب سے بچا کر بارگاہ صمدیت میں حاضر کرنا ہے۔ اور چونکہ انبیاء کرام صفات مذکورہ میں تمام مخلوق سے ممتاز ہوتے ہیں اس لیے ان پر شیطان کے غالب آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب آپ ہی فیصلہ

نافرمانی کروں بڑے دن کے عذاب سے۔ (سورہ یونس ۱۵)
 قرآن مقدس میں ہر طرح کی دخل اندازیوں کا سد باب کرنے کے بعد ہی رب کریم نے یہ اعلان فرمایا: (وانہ لکتاب عزیز، لایستایہ الباطل من بین یدیدہ ولا من خلفہ، تنزیل من حکیم حمید) اور بلا ریب یہ بڑی حرمت والی کتاب ہے۔ اس کے نزدیک نہیں آسکتا باطل نہ اس کے سامنے ہے اور نہ پیچھے سے۔ یہ اتاری ہوئی ہے بڑے حکمت والے، سب خوبیاں سراہے کی طرف سے۔ (سورہ عبہ ۴۱، ۴۲)۔ بھلا اس کتاب میں دخل اندازی کی جنوں اور شیطانوں کی کیا مجال جس کی حفاظت و نگہبانی کی ذمہ داری خود خلاق دو عالم نے لے رکھی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: (انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون) بے شک ہم نے ہی اتارا ہے اس ذکر (قرآن) کو اور یقیناً ہم ہی اس کی محافظ ہیں (سورہ الحجر ۹)

مندرجہ بالا اسطور میں متعدد قرآنی آیات کے ذریعہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ نہ تو شیطان ملعون کو اللہ رب العزت نے اتنی طاقت دے رکھی ہے کہ ایسی حرکت کر سکے اور نہ ہی سرور کائنات سے کسی بھی صورت میں اس قسم کے کلمات کا صدور ممکن ہے۔ اس لیے کہ فرمان خداوندی ہے: (ولو تقول علینا بعض الاقوال، لاخذنا منه بالیمین، ثم لقطعنا منه الوتین، فمما منکم من احد عنہ حجین) اگر وہ خود گڑھ کر بعض باتیں ہماری طرف منسوب کرتا تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے پھر ہم کاٹ دیتے اس کی رگ دل۔ پھر تم میں سے کوئی بھی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا۔ (سورہ الحاقہ از ۳۳ تا ۳۷) بفرض محال اگر نبی پاک کی زبان مقدس سے یہ کلمات ادا ہوئے ہوتے، تو اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک کو بجائے تسلی و تشفی دینے کے عتاب نازل فرماتا اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سرداران قریش سے بات چیت کے درمیان اپنے ایک نایاب غلام (عبداللہ ابن ام مکتوم) سے صرف معمولی اعراض فرمالیا تھا تو اللہ عزوجل نے انتہائی سخت الفاظ میں تنبیہ فرمائی (عبس و تولى ان جائه الا عسى.....) پھر بھلا یہ کب ممکن ہے کہ زبان رسول سے ایسے الفاظ ادا ہوں جو عقیدہ توحید کی بنیاد ہلا دیں، اور اس پر بھی جلال کبریا جوش میں آنے کی بجائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تسلی و تشفی دے۔ واللہ هذا لشیء عجیب۔

یہاں تک دو باتیں دلائل و برہان کی روشنی میں ثابت ہو چکی ہیں

کیجیے جو شیطان اتالا چارو بے بس ہے کہ وہ اللہ کے نیک و صالح بندوں اور عام انبیاء کرام پر غلبہ نہیں پاسکتا، تو بھلا کب اور کیسے یہ ممکن ہے کہ وہ سید الانبیاء علیہ افضل الصلاۃ و التسلیم پر غالب آجائے؟

جہاں تک اس شیع ہدایت کا تعلق ہے جو کہ اللہ عزوجل انبیاء و مرسلین کے ذریعہ اپنے بندوں کی رشد و ہدایت کے لیے نازل فرماتا ہے، تو اس میں کسی قسم کی دخل اندازی شیطان کی قدرت سے خارج و بالاتر ہے اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو آسمان پر پہرا مزید سخت کر دیا، پہلے تو جن کوئی نہ کوئی ایسا گوش تلاش کر لیتے تھے جہاں بیٹھ کر آسمان پر ہونے والی بات چیت کو سن سکیں، لیکن اب ایسا کرنا ان کے لیے ممکن نہ رہا۔ اب تو جیسے ہی وہ آسمان کی جانب جانے کی سعی کرتے ویسے ہی شہابوں کا مینہ ان پر برسنے لگتا۔ اس حقیقت کو آپ خود جنوں کی زبانی ملاحظہ فرمائیں: (وانا لمسنا السماء فوجدناها ملئت حرسا شدیداً و شہباً، وانا کنا نقعد منها مقاعد للسمع، فمن یستمع الان یجد له شہباً وصداً) ہم نے ٹٹولنا چاہا آسمان کو تو ہم نے اس کو سخت پہروں اور شہابوں سے بھرا ہوا پایا، اور پہلے تو ہم بیٹھ جایا کرتے تھے اس کے بعض مقامات پر سننے کے لیے، لیکن اب جو (جن) سننے کی کوشش کرے گا تو وہ پائے گا اپنے لیے کسی شہاب کو انتظار میں۔ (سورہ الجن ۹، ۸)

اس میں کوئی شک نہیں کہ آسمانوں کی حفاظت کا جو یہ اہتمام مبلغ فرمایا گیا تھا اس کا ہدف اولیں صرف اور صرف یہی تھا کہ کلام ربانی جس کا نزول انسانوں کی ہدایت کے لیے ہو رہا تھا وہ ہر قسم کی دخل اندازیوں سے منزه اور پاک رہے۔ اس وحی الہی میں جنوں اور شیطانوں کی دخل اندازی کی جرأت تو درکنار، خود رسول خدا کو بھی اس امر کی قطعاً اجازت نہ تھی کہ وہ از خود اس کی کسی بھی آیت میں زبردستی برکی ترمیم کر سکیں۔ یہی سبب تھا کہ جب مشرکین مکہ نے رسول ہاشمی سے مطالبہ کیا کہ آپ قرآن میں کچھ تغیر کر دیں تو آپ کے رب نے حکم دیا اے محبوب! ان کفار مکہ سے دو ٹوک الفاظ میں یہ فرما دیجیے: (قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقاء نفسی، ان اتبع الا ما یوحی الی، انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم) فرما دیجیے مجھے اختیار نہیں کہ رد و بدل کر دوں اس میں اپنی مرضی سے۔ میں نہیں پیروی کرتا (کسی چیز کی) بجز اس کے جو وحی کی جاتی ہے میری طرف۔ میں ڈرتا ہوں اگر میں اپنے رب کی

کہ اللہ عزوجل نے شیطان کو اس قدر اختیارات نہیں عطا فرمائے کہ وہ بالآخر انسانوں کو کسی کام کے لیے مجبور کر سکے، اور نہ ہی بحیثیت رسول ہونے کے زبان رسالت سے ان الفاظ قبیحہ کی ادائیگی ممکن ہے۔ ذیل میں اب ہم اس قصے کو اس زاویے سے پرکھنا چاہتے ہیں کہ اس میں جن متعدد و مختلف واقعات کو یکجا کیا گیا ہے، کیا ان کی تاریخی حیثیت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ انہیں ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں قرار دیا جاسکے؟ مذکورہ افسانے کو اگر ہم غور سے دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں مندرجہ ذیل واقعات کو زمانے کے حساب سے یکجا کیا گیا ہے:

۱۔ سورہ نجم کا زمانہ نزول، کیوں کہ اسی کے نزول کے وقت ان شیطانی کلمات کی ادائیگی کا مستشرقین نے دعویٰ کیا ہے۔
۲۔ مہاجرین حبشہ کی مکہ واپسی، اس لئے کہ اسی واقعہ کو ان کی واپسی کا سبب قرار دیا گیا ہے۔

۳۔ سورہ حج کا زمانہ نزول، کیوں کہ آیت کریمہ ”وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ - اَلْیَ اٰخِرَ الْاٰیَةِ“ سورہ حج کی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے ذریعہ اعلان کیا گیا ہے ”تَلْکَ الْغُرَانِیْقُ الْعَلٰی“ - والے کلمات شیطانی آمیزش تھے، انہیں منسوخ کر دیا گیا ہے اور اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی کہ شیطان اس قسم کی حرکتیں انبیاء سابقین کے ساتھ بھی کرتا رہا ہے۔

اس خود ساختہ کہانی میں سب سے تعجب خیز اور حیران کن بات یہ ہے کہ قرآن کریم کی جس آیت کی تفسیر کے طور پر یہ افسانہ گڑھا گیا ہے یعنی ”وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ..... الْاٰیَةِ“ وہ آیت کریمہ سورہ حج کی ہے جو کہ مدنی سے اس کا سیاق و سباق بتا رہا ہے کہ یہ سورہ سن ایک ہجری میں نازل ہوئی ہے۔ مگر قصہ غرائق کی بیشتر روایات میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اسی آیت مبارکہ کے ذریعہ نبی پاک صاحب لواک ﷺ کو تسلی دی گئی۔ اور اس آیت کے نزول کے بعد ہی حضور ﷺ کا رنج و غم دور ہوا ہے۔ درحقیقت سورہ النجم کا نزول واقعہ معراج کے بعد ہوا ہے۔ چونکہ اس سورہ کی ابتدائی آیتوں میں معراج النبی ﷺ کا تذکرہ ملتا ہے بالخصوص اس آیت کریمہ میں ”عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاوٰی“ اور معراج رسول کے بارے میں تمام محدثین کرام کا اتفاق ہے کہ یہ واقعہ ہجرت نبوی سے ایک یا دو بیڑھ سال قبل وقوع پذیر ہوا ہے۔ لہذا سورہ النجم کے نزول کا زمانہ بعثت کے

پانچویں سال کو ٹھہرانا قطعاً درست نہیں۔ لیکن بفرض محال اگر سورہ النجم کا زمانہ نزول بعثت کے پانچویں سال کو تسلیم کر لیا جائے تو تاریخی اعتبار سے اس واقعہ کی تفصیل یہ بنے گی، کہ (معاذ اللہ) بعثت کے پانچویں سال حضور ﷺ کی زبان مبارک پر شیطان نے تلک الغرائق العلیٰ کے کلمات جاری کئے، اور اسی شام کو سید الملائکہ جبرئیل امین نے تو اس سے اپنی براعت ظاہر کر دی، مگر اس لغزش کے باعث سید عالم ﷺ رنج و غم کے آتھہ سمندر میں ڈوب گئے اور یہ سلسلہ تقریباً آٹھ یا نو سال کے عرصہ تک جاری رہا، یہاں تک کہ سن ایک ہجری میں سورہ حج نازل ہوئی، جس میں آیت: ”وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ..... الْاٰیَةِ“ کے ذریعہ رسول پاک کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا گیا کہ قرآن حکیم میں یہ آمیزش شیطانی القاسے ہو گئی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے اب منسوخ فرما دیا ہے۔

اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا کوئی صاحب عقل سلیم اس قسم کی تاریخ کو تسلیم کرے گا؟ اگر آپ تاریخ کے کسی مبتدی طالب علم سے بھی اس کے بابت دریافت کریں گے تو وہ بھی یقیناً یہی کہتا ہوا نظر آئے گا کہ جن لوگوں نے یہ قصہ گڑھا ہے وہ یہ بھول گئے ہیں کہ ان مختلف کڑیوں کا آپس میں کوئی تال میل نہیں ہے۔

اب ہم اس روایت کو اس کی سند و متن کے اعتبار سے پرکھنے کی کوشش کریں گے، چونکہ یہ روایت دین کے بنیادی اصولوں سے متصادم ہے اور متعدد آیات قرآنی کی مخالفت کر رہی ہے، لہذا عقل سلیم کا کہنا ہے کہ اس روایت کی اسناد میں اتنی قوت ہو ہی نہیں سکتی کہ اسے قابل اعتنا سمجھا جائے۔

اس واقعہ کو جس طرح روایات میں بیان کیا گیا ہے، بالفرض اگر یہ ایسے ہی پیش آیا ہے تو اس واقعہ کو مکہ کا ایک تاریخی واقعہ ہونا چاہئے، نیز ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ متعدد صحابہ کرام اسے بیان کرتے، لیکن اس قصے کو بیان کرنے والی روایات کی سندوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ واقعہ رئیس المفسرین حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے سوا، دیگر کسی بھی صحابی رسول سے مروی نہیں ہے، ساتھ ہی ہمیں تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی عمر شریف بوقت ہجرت صرف تین سال تھی، گو با بعثت رسول کے پانچویں سال جب ان روایات کے مطابق یہ واقعہ پیش آیا، اس وقت ابھی آپ کی ولادت

جاسکتا ہے بالخصوص جب کہ وہ متعدد آیات قرآنی آیات اور دین حنیف کے بنیادی اصولوں سے متصادم بھی ہو۔

قصہ غرائیق کو بیان کرنے والی روایات کی صرف اسناد ہی ناقابل اعتماد نہیں بلکہ ان روایات کے متن کی بھی یہی حالت ہے، ان روایتوں کے متن میں اتنا واضح اختلاف واضطراب ہے کہ اس اضطراب کی موجودگی میں، ان روایات کی کوئی قیمت و وقعت باقی نہیں رہ جاتی۔ کسی روایت میں آیا ہے کہ حضور ﷺ کی زبان مبارک سے یہ کلمات دوران نماز نکلے تھے، اور بعض روایات کہتی ہیں کہ نبی پاک کی زبان سے جب یہ الفاظ ادا ہوئے تھے اس وقت آپ اپنی قوم سے مخاطب تھے، بعض دیگر روایتوں میں ملتا ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان فیض ترجمان سے یہ الفاظ نکلے اس وقت آپ پر نیند کا غلبہ تھا۔ علاوہ ازیں اور بھی بہت سی روایات ہیں جن میں مختلف حالات و کیفیات کا تذکرہ ملتا ہے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ خود وہ الفاظ و کلمات جو شیطان نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر جاری کیے تھے وہ بھی ہر روایت میں مختلف ہیں۔ مثال کے طور پر ایک روایت میں ہے ”انھن الغرائیق العلی“ دوسری روایت میں صرف اتنا ہے۔ ”ان شفاعتھن تترجعی“ تیسری روایت میں ہے۔ ”تلك الغرائیق العلی وان شفاعتھن لترجعی“ یہ تو ہم نے بعض روایتوں کا ذکر علی سبیل المثال کیا ہے نہ کہ علی سبیل الحصر، جب کہ امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی تصنیف ”الدر المنثور“ میں کم و بیش ایک درجن روایتیں ذکر کی ہیں اور ہر ایک میں مختلف الفاظ کا تذکرہ ہے۔

صرف یہی نہیں کہ مختلف روایات میں مختلف الفاظ کا ذکر ہے بلکہ ایک اور مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ اکثر روایات میں تو یہ ہے کہ تسلک الغرائیق العلی والے کلمات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے افریتم اللت والعزی ومنوۃ الثالثة الاخری کے بعد شیطان نے جاری کرائے تھے، مگر ایک روایت ایسی بھی ملتی ہے کہ یہ الفاظ اس سے ایک اور آیت بعد یعنی تسلک اذا قسمة ضیعی کے بعد آپ کی زبان مبارک پر جاری ہوئے۔ ان روایات کا اختلاف واضطراب واضح اور بین طور پر اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ یہ قصہ موضوع اور سرے سے باطل ہے۔ نیز مخالفین اسلام کی اختراع و تخلیق ہے۔

علماء محققین کی رائے:۔ علماء محققین نے ہر عصر و مصر میں اس

باسعادتی ہی نہ ہوئی تھی، اس لئے یہ بات ہر طرح کے شک و ریب سے بالاتر ہے کہ آپ اس واقعہ کے چشم دید گواہ ہیں یہ واقعہ اختراع کرنے والوں کو یہ خیال بھی نہیں آیا کہ وہ اس پر غور کر لیں کہ جس سال وہ اس واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کو بیان کر رہے ہیں۔ آیا اس سال اس کے راوی کی ولادت بھی ہوئی تھی یا نہیں۔ اب ذیل میں ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ جن روایات میں یہ قصہ بیان ہوا ہے ان کی سند کی حیثیت کیا ہے۔ اور ان کے متعلق علماء جرح و تعدیل کی آراء کیا ہیں:

☆ امام بیہقی رحمہ اللہ جن کا شمار اکابرین محدثین میں کیا جاتا ہے وہ تحریر فرماتے ہیں کہ ”هذه القصة غیر ثابتة من جهة النقل“ یہ قصہ از روئے نقل ثابت نہیں ہے۔

☆ حضرت قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس روایت کی ایک سند بکلی عن ابی صالح عن ابن عباس بھی مشہور ہے۔ لیکن اس کے بعد فرماتے ہیں کہ ”واما حدیث الکلبی فمما لا یجوز الروایة منه ولا ذکره لقوة ضعفه و کذبہ“ جہاں تک کلبی کی حدیث کا تعلق ہے، تو کلبی ایسا شخص ہے جس کے ضعف اور کذب کی وجہ سے، نہ تو اس سے روایت جائز ہے اور نہ ہی اس کا ذکر کرنا صحیح ہے۔

☆ قاضی ابوبکر ابن عربی رحمہ اللہ نے از روئے نقل اس قصے پر شدید نقد فرمایا ہے۔ آپ فرماتے ہیں ”هذا من وضع الزنادقة یعنی یہ قصہ زندیقوں کی اختراع و ایجاد ہے۔ آپ نے اس کی تردید و ابطال میں ایک کتاب بھی تحریر فرمائی ہے۔

☆ حضرت امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ نے بھی اس قصہ کو موضوع قرار دیا ہے، فرماتے ہیں: ”تلك الغرائیق العلی من جملة ایحاء الشیطان الی اولیائہ من الزنادقة حتی یلقوا بین الضعفاء وأرقاء الدین لیسر تابوا فی صحة الدین، والرسالة برؤية من مثل هذه الرواية“ ”تلك الغرائیق والواقعة ان باتوں میں سے ہے جو شیطان ان زندیقوں کے دلوں میں ڈالتا ہے جو اس کے ساتھی ہیں، تاکہ وہ انہیں کمزور ایمان والوں میں پھیلائیں، اور ان کی نظر میں دین کو مشکوک بنائیں۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن کرم اس قسم کی فضول روایات سے بری اور منفرہ ہے۔

غور طلب بات تو یہ ہے کہ جس روایت کی تمام سندوں کو ناقدین حدیث کی نظر میں یہ حیثیت حاصل ہے، اس پر بھلا کیسے اعتماد کیا

و بہتان پر مبنی اس افسانے کی تردید شدت کے ساتھ کی ہے لیکن ہم مندرجہ بالا اقوال پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

اسلام پر جب بھی، اور جس نے بھی حملہ کیا بفضل اللہ اس نے ہمیشہ منہ کی کھائی، کچھ ایسا ہی حال مستشرقین کا بھی ہوا، محققین اسلام نے مستشرقین کی جانب سے ہونے والے تمام حملوں کا دندان شکن اور منہ توڑ جواب دیا، لیکن ایک کہادت ہے ”رسی جل گئی پر بل نہ گیا“ یہ محاورہ مستشرقین پر صدی صدی صادق آرہا ہے، کیونکہ یہ ہر محاذ پر خائب و خاسر ہونے کے بعد بھی اپنی گھٹیا اور ذلیل حرکتوں سے باز نہ آئے اور اس کی واضح و روشن مثال خود قصہ غرائق ہے گو کہ علماء ملت اسلامیہ نے ان کے تمام حملوں کو ناکام بنادیا، بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ان کی ہر اینٹ کا جواب پتھر سے دیا، جس کے نتیجہ میں وہ میدان چھوڑ کر فرار تو ہو گئے لیکن اپنی فطرت قدیمہ کے مطابق جاتے جاتے ہوا میں کچھ تیر چھوڑ گئے، جن کا ہمیں ابھی جواب دینا ہے، قصہ غرائق سے متعلق مستشرقین کے جب تمام فرضی دعوے باطل ہو گئے تو انہوں نے مندرجہ ذیل تین شوشے پھر چھوڑ دیئے: جن کا جواب بھی بعون اللہ ہم سوالوں کی ترتیب سے ہی دیں گے۔

(۱) اگر قصہ غرائق صحیح نہیں تو مہاجرین حبشہ کے اتنی جلدی مکہ واپس آ جانے کی کیا وجہ تھی؟

(۲) اگر ”تک الغرائق العلی“ والی بات درست نہیں تھی تو مشرکین مکہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر حبشہ کیوں کیا تھا؟

(۳) اگر یہ واقعہ صحیح نہیں تو سورہ حج کی اس آیت کریمہ: ”وَمَا ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی...“ کا مفہوم کیا ہوگا؟

☆ جہاں تک مہاجرین حبشہ کی مکہ واپسی کا معاملہ ہے تو اس کی وجہ مؤرخین نے بیان فرمائی ہے کہ مہاجرین کے قیام حبشہ کے دوران، دو بڑے ہی اہم واقعات پیش آئے: ایک تو مکہ معظمہ میں حضرت سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کر لیا تھا، اور اللہ کے اس شیر کی بیعت سے کفار مکہ مسلمانوں کو مسجد حرام میں نماز ادا کرنے سے منع کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے، دوسرا یہ کہ نجاشی کے مذہب اسلام کی جانب رجحان و میلان کو دیکھ کر حبشہ میں اس کے معاندین پس پردہ علم بغاوت بلند کرنے کی سعی کرنے لگے تھے، حبشہ کے ان داخلی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے، جب مہاجرین حبشہ کو مکہ میں حضرت عمر کے اسلام لانے

قصہ کو موضوع اور زنادقہ کا اختراع ثابت کیا ہے جن علماء نے اس واقعہ کی تردید و ابطال کا مقدس فریضہ انجام دیا ہے ان کی فہرست کافی طویل ہے لیکن بخوف طوالت ہم یہاں ان میں سے صرف چند کا نام ذکر کریں گے۔

☆ حضرت امام فخر الدین رازی علیہ الرحمۃ نے انتہائی شدت سے اس روایت کا رد کیا ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ: اگرچہ سطحی قسم کے لوگوں نے اس روایت کو لکھا ہے لیکن علماء محققین کا اس کے متعلق متفقہ فیصلہ یہ ہے: ”هذه الرواية باطلة موضوعة“ یہ روایت جھوٹی اور گھڑی ہوئی ہے۔

☆ امام عبد اللہ القرطبی رحمہ اللہ نے ”احکام القرآن“ میں اس روایت کی خوب تردید فرمائی ہے۔ اس روایت کی تمام اسانید پر تنقید کرنے کے بعد رقم طراز ہیں ”فسی ذلک روایات کثیرة کلھا باطلہ لا اصل لھا“ اس سلسلہ کی تمام روایات باطل و بے بنیاد ہیں۔

☆ اس من گھڑت قصے کے متعلق علامہ ابن حزم ظاہری کی رائے کا خلاصہ یہ ہے: ”وہ حدیث جس میں غرائق کا واقعہ درج ہے، وہ سفید جھوٹ اور موضوع ہے کیوں کہ یہ قصہ از روئے نقل کے قطعاً ثابت نہیں۔ اس لئے اس کے متعلق بحث کرنے کا کوئی مطلب نہیں۔ کیونکہ جھوٹ کوئی بھی شخص گڑھ سکتا ہے۔“

☆ کذب و افتراء سے پر اس افسانے کے متعلق سابق شیخ لا زھر امام محمد عبدہ کی رائے ملاحظہ ہو: العصمة من العقائد التي يطلب فيها اليقين فالحديث الذي يريدها خرمها ونقضها لا يقبل على أي وجه جاء وقد عد الأصوليون الخبر الذي يكون على تلك الصفة من الأخبار التي يجب القطع بكذبها هذا لو فرض اتصال الحديث فما ظنك بالمراسيل، یعنی عصمت (انبیاء) ان عقائد میں سے ہے جن پر یقین رکھنا شرعاً ضروری ہے، ایسی حدیث جو اس عقیدے کو ضرر رساں ہو وہ کسی بھی طریقے سے مروی ہو مقبول نہیں ہے، علماء اصول کا فیصلہ یہ ہے کہ جو حدیث اس قسم کی ہو اس کو قطعیت کے ساتھ جھوٹ قرار دینا واجب ہے، یہ حکم تو اس صورت میں سے جب اس قسم کی حدیث مرفوع ہو، جب اس قسم کی مرفوع حدیث کے متعلق حکم یہ ہے تو مرسل روایات کی حیثیت ہی کیا ہے؟“

ان محققین علماء کے علاوہ دیگر علماء ملت اسلامیہ نے بھی کذب

کی اطلاع ملی تو انہوں نے جہنم میں مزید قیام کی بجائے مکہ واپس لوٹ جانے کو ترجیح دیا۔ علاوہ ازیں یہ بھی ممکن ہے کہ جب قریش کے سفارتی تعلقات بھی ناکام ہو گئے اور شہنشاہ نجاشی نے مسلمانوں کو کفار مکہ کے حوالے کرنے کے مطالبہ کو مسترد کر دیا ہو تو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت خود مشرکین مکہ نے یہ افواہ اڑادی ہو، تاکہ اس افواہ کو سن کر مسلمان از خود جہنم چھوڑ کر مکہ واپس چلے آئیں۔

☆ اب رہا سوال مشرکین مکہ کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر جہنم کرنے کا تو یہ بات روایات صحیحہ سے ثابت ہے لیکن اس کا سبب قصہ غرائق کو ٹھہرانا سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ کلام رب العالمین کو حبیب رب العالمین کی زبان فیض ترجمان سے سن کر عرب نے ہزاروں کی تعداد میں اپنا آبائی دین چھوڑ دیا ہے، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسا سخت دل شخص بھی اپنی ہمیشہ سے کلام ربانی کی چند آیات سن کر ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ سرداران قریش نے قرآن کی فصاحت و بلاغت کے سامنے اپنی گردنیں خم کر دی ہیں لہذا یہی اسی کلام بلاغت ہی کہ قوت تاثیر تھی کہ جب سورہ نجم کی آیت جحدہ تلاوت کرنے کے بعد صاحب قرآن ﷺ نے جحدہ فرمایا تو وہ کفار جو دوران تلاوت اس کلام کی فصاحت پر انگشت بدندان تھے وہ بھی بے ساختہ جحدہ ریز ہو گئے۔

☆ مشرکین کا یہ کہنا کہ اگر قصہ غرائق درست نہیں تو پھر سورہ حج کی اس آیت کا کیا مفہوم ہوگا تو اس کا جواب یہ ہے کہ سورہ حج کی اس آیت کریمہ میں نہ تو نبی پاک کے کسی فعل کا تذکرہ ہے جس کی اصلاح کی جارہی ہو۔ اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی رنج و غم کا ذکر ہے جس پر آپ کو تسلی و اطمینان قلبی دی جارہی ہو، اور نہ اس آیت کے سیاق و سباق میں اس قسم کی کوئی چیز مذکور ہے، بلکہ اس آیت میں اللہ عز و جل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف اور صرف انبیاء و رسل کے متعلق اپنی ایک سنت پر مطلع فرما رہا ہے کہ جب بھی کوئی نبی یا رسول، اللہ کا پیغام اس کے بندوں کو پڑھ کر سناتا ہے تو شیطان ملعون لوگوں کو اس ہدایت سے محروم رکھنے کے لئے سامعین کے دلوں میں قسم قسم کے وسوسے ڈالتا ہے، وہ لوگوں کو ورغلا تا ہے کہ خدا کا پیغمبر تمہیں جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر عمل کرو گے تو تم نقصان و زیاں میں رہو گے، تمہارے مفادات کو دھچکا لگے گا اور تم طرح طرح کی پریشانیوں سے دوچار ہو گے، لیکن رب

کائنات شیطان کے ان وسوسوں کو ختم کر دیتا ہے اور اپنی آیات کو محکم فرما دیتا ہے، لہذا اس آیت کریمہ کا مفہوم حقیقی یہ ہے نہ کہ وہ جسے مستشرقین یا ان کے دم چھلے بیان کرتے پھر رہے ہیں۔

☆ مشرکین کی تابوت میں آخری کیل:۔ مشرکین کے بھونڈے اور غیر معقول سوالات و اعتراضات کے جواب میں ائمہ اسلام کے اقوال ہی کافی تھے، مگر مضمون کے آخر میں خیال آیا کہ مزید چند سطریں سپرد قسطاس کر کے عقلا بھی اس جعلی افسانے کا بطلان ثابت کر کے مشرکین کی تابوت میں آخری کیل گاڑ دی جائے۔ تاکہ مستقبل میں پھر کبھی سر اٹھانے کی جرأت نہ کر سکیں، نیز ان کی عداوت اسلام اور سقاہت اہل زمانہ پر آشکارا ہو جائے۔

☆ قصہ غرائق کے جتنے بھی ممکنہ اعتبارات ہو سکتے ہیں کسی بھی اعتبار سے قابل قبول نہیں چونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت اور الہامی کتاب کی حفاظت کے خدائی انتظامات کی موجودگی میں اس قسم کے بے ہودہ اور نازیبا الفاظ کا زبان رسول معظم سے ادا ہونا ہرگز ہرگز ممکن نہیں۔ عربی زبان کا مبتدی طالب علم بھی یہ خوب جانتا اور سمجھتا ہے کہ یہ کلمات (تسلک الغرائق العلی) اسلام کے عقیدہ توحید سے متضاد ہیں۔ اس پورے افسانے میں سب سے حیران کن اور تعجب خیز بات یہ ہے کہ مشرکین نے تو یہ کلمات سنتے ہی فوراً سمجھ لیا کہ حضور ﷺ نے اسلام سے ناطہ توڑ کر اپنے آباء و اجداد کے دین سے رشتہ جوڑ لیا ہے۔ مگر اتنی بڑی بات کو نہ تو حضور ﷺ نے محسوس کیا اور نہ ہی آپ ﷺ کے جان نثار صحابہ نے، یہاں تک کہ جبریل امین نے آپ کو متنبہ کیا، کیا اس واقعہ کے وقت تمام اہل ایمان بخواب تھے یا سب پر غشی طاری تھی۔ خدا کا کلام تو مخلوق کے کلام سے ممتاز ہوتا ہے۔ ولید بن مغیرہ و دیگر کفار عرب، تاریکی کفر کے باوجود قرآن حکیم کی آیات بینات کو دیگر کلاموں سے اول سماعت میں ممتاز کر لیتے تھے پھر بھلا یہ کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ فصیح العرب ﷺ (معاذ اللہ) شیطان کے کلام کو کلام باری تعالیٰ سے ممتاز نہ کر سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی مصنف مزاج اور صاحب عقل سلیم اس خرافات کو ہرگز تسلیم نہیں کرے گا۔

☆ جس رسول کی سیرت طیبہ کا مطالعہ ہمیں یہ بتا رہا ہے کہ ایک بار قبیلہ ثقیف اور قریش نے مشترکہ طور پر رسول ہاشمی کو پیش کش کی،

بقیہ: صفحہ ۱۶ پر ملاحظہ فرمائیں

ذرا سوچیں!

مٹھی بھر یہودی دنیا کے حاکم کیوں ہیں؟

ذرا سوچیں کہ آخر صدیوں تک معتب رہی یہودی قوم جسے بخت نصر سے لیکر بظلمت صرف عتاب دنیا کا سامنا رہا، جس کی آبادی حقیر، قدرتی وسائل محدود اور جغرافیہ مسدود ہے، وہ نہ صرف یہ کہ آج خود ہر لحاظ سے مضبوط ہے اور نظام سیاست کا قطب اپنے ہاتھوں میں لیے ہوئے ہے، بلکہ گذشتہ صدیوں پر نگاہ ڈالیں تو تمام ناہمواریوں کے باوجود ایسے نابغہ بائے روزگار پیدا کرنے میں کامیاب رہی ہے، جنہوں نے عالمی سیاست و حکمت کو تہہ و بالا کر دیا۔ مثلاً مارکس اور انیشتائین کا ہی نام لے لیں اور آج تو سب کچھ انہیں کے ہاتھوں میں، انہیں کے سہارے اور انہیں کے اشارے پر چلتا ہے اور دنیا کا سب سے طاقتور ملک امریکہ کا نظام سیاست و معیشت تو جیسے ان کی لونڈی ہے یا یرغمال۔ خواہ بالی ووڈ ہو یا نیوز انجینیئر، نیوز چینل ہوں یا بڑے سے بڑا اخبار، امریکی معیشت پر قابض بڑی بڑی کمپنیاں ہوں یا سیاست و حکومت کی پرچہ گلیوں پر مسلط پالیسی ساز دانشور۔ ہر جگہ انہیں کا راج ہے اور ہر مقام پر انہیں کا سحر اور جب یہ سحر سپر پاور پر اس قدر حاوی ہے تو اس کے جادو سے باقی دنیا کیونکر اچھوٹی رہ سکتی ہے۔ آپ اگر نگاہ اٹھانے کی زحمت کریں تو دیکھ سکتے ہیں کہ ہمارے ارد گرد، پاس پڑوس، آگے پیچھے ان کی کرشمہ سازیوں کی جلوہ نمایاں ہیں۔

دوسری طرف مسلمان ہیں۔ صدیوں متمدن دنیا پر حکومت کی، تمام علوم دنیا جمع کر لئے، ساری طاقتوں کو شکست دے دی، ساری سازشوں کو ناکام کر دیا اور تمام براعظموں پر پھیل گئے۔ چلتے یہ بات تھوڑی پرانی ہو گئی۔ لیکن اب بھی کیا کمی ہے؟ پچاس سے زیادہ ممالک، ایک ارب سے بیشتر آبادی، جکارتا سے رباط تک پھیلاؤ، تیل اور معدنیات کے لامحدود ذخائر اور دلیر و جفاکش و ذہین ترین اقوام پر مشتمل ہے آج بھی اسلامی دنیا۔ پھر بھی مقہور، پھر بھی مردود۔ وسائل رکھ کے بھی بھکاری اور حکومت رکھ کے بھی در بدر۔ تہذیبیں پہنچ کر بھی شناخت کی جستجو میں سرگرداں اور ملکوں کو بنا کر بھی احساس بے وطنی کے شکار۔ اقراء پڑھ کے بھی ناخواندہ اور لائق تفتظو اکا و رد کر کے بھی مایوسی کے مر لیض۔

ہم یہودیوں اور صہیونیوں کو لعن طعن اور گالیاں دیتے نہیں جھکتے اور یہ رویہ عالم اسلام میں یکساں طور پر عام ہے۔ میرا مقصد مسلمانوں کو ان کے اس جمہوری حق سے باز رکھنا نہیں اور نہ ہی یہ کہ پوری دنیا میں یہودیوں کی سازشوں کے سبب پھیلے خرافات اور اندھیر گردی کا دفاع کرنا ہے۔ لیکن کیا ہم نے کبھی ٹھنڈے دل سے اس قضیے کے بارے میں کبھی سوچا بھی ہے کہ کیوں مٹھی بھر یہودی قوم دنیا اور کاروبار دنیا کو اپنے عزائم اور اپنے پروگراموں کی تکمیل کے لیے بڑے دھڑلے سے استعمال کر رہی ہے اور دنیا بھی ان کے سامنے آمنا صدقنا کہتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ دنیا میں ان کی آبادی اتنی ہی ہے جتنی ہمارے کسی بڑے شہر میں رہنے والے باشندوں کی، لیکن سچ یہ ہے کہ ہزاروں بھیڑیوں کے گلہ کے لیے ایک چرواہا کافی ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی حالت بھیڑیوں کے گلوں سے بہت ملتی جلتی ہے۔ جدھر ہانک دیا، چل پڑے۔ نہ سوچا، نہ سمجھا اور نہ اس کی صلاحیت پیدا کی۔ زندگی کا نہ کوئی نصب العین، نہ حالات سے آگاہی، نہ ماضی کی خبر، نہ حال سے آشنائی۔ پیٹ بھر اور اللہ کا نام لیکر ڈکار لے لیا اور بس سمجھ لیا کہ دنیا داری بھی نبھ گئی اور دین کا حق ادا ہو گیا۔

بغور دیکھیں اور تھوڑی زحمت کر کے تاریخ کے اوراق پلٹیں تو پائیں گے کہ یہودیوں کے حالات ہمیشہ ناگفتہ بہ رہے ہیں۔ ہمیشہ مختلف قوموں اور خاص طور سے اہل مغرب کے نشانے پر رہے۔ نشانے پر مسلمان بھی تھے، لیکن انہوں نے ان تمام حملوں کو ناکارہ ثابت کر دیا۔ یہ خطرات آج بھی ہیں اور مجموعی طور پر مسلمانوں سے زیادہ یہودیوں کو ہیں اور اسی سبب ان دونوں قوموں میں فی زمانہ ایک نفسیاتی مشابہت بھی پائی جاتی ہے اور وہ ہے: انسکیوریٹی فیلینگ یا احساس خطر۔

یہیں پر سوچنے کی ضرورت ہے، اس فرق کو سمجھنے، تجزیہ کرنے، جائزہ لینے اور امراض ملی کی صحیح تشخیص اور اسکے مداوا کی ضرورت ہے۔ بہت سارے سوالات اٹھانے اور ان کے جوابات ڈھونڈنے کی ضرورت ہے اور وقت کے ان اہم ضرورتوں کے ساتھ بہت اہم ضرورت ہے ان پر عمل کرنے اور عمل کرانے کی۔

سوال اٹھتا ہے، آخر ایسا کیوں؟ یہودی محدود وسائل اور نفرت و قہر کا شکار رہ کر بھی حکومت و معیشت، علوم و حکمت، ذرائع رسل و رسائل کے نا خدا، دنیا کی قوموں کی تقدیریں بدلنے والے فیصلوں میں ان کا رول، بدلتے زمانے کے نبض پر ان کا ہاتھ اور دنیا کے بیشتر طاقتور ہاتھوں کے ہاتھ میں ان کا ہاتھ۔ دنیا کی ہر چھوٹی بڑی خبر سے باخبر اور ہر چھوٹے بڑے دوست دشمن سے آشنا۔ صدر اسلام میں بیٹھ کر عالم اسلام کا شیرازہ بکھیرنے میں مصروف اور... مسلمان... اپنے ہی کچھار میں مجبور و محصور، سب کچھ رکھ کر قلاش، بے بس، بے سہارے، بے چارے، قسمت کے مارے، بے فرہنگ و بے تمدن۔ ہر جانفریں اور دھتکار۔ یہ خواہ پرانی دلی کے کوچہ میں بیٹھے ہوں یا لاہور کے چوراہے پر، لندن کی سڑکوں پر ٹہل رہے ہوں یا پیرس کے کلیوں میں پڑے ہوں، قندھار میں ہوں یا کربلا میں، تہران میں ہوں یا قاہرہ میں، بیروت میں ہوں یا انقرہ میں۔ غرض کہ کرۂ ارض کے اس کونے سے لیکر اس کونے تک نظر دوڑا جائیے، کم و بیش یہی حالت اور یہی نفسا نفسی۔ ہر خبر میں مسلمان اور ہر مسلمان کی تضحیک۔

وجہ صاف ہے، لیکن ہم بے خبر، مطلع بھی صاف ہے لیکن قصور نظروں کا ہے جو اٹھتی ہی نہیں اپنی تنگ و تاریک گلیوں سے۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا کہ دونوں قومیں احساس خطر کا شکار ہیں لیکن دونوں کا رد عمل مختلف ہے۔ ایک کا رد عمل کامیابی کی اونچائیوں تک لے جاتا ہے اور دوسرے کا پچھڑے پن کے غار میں، کیونکہ ایک لا تقصط کو مانتا ہے اور دوسرا صرف اس کا ورد کرتا ہے لیکن عملاً تقصط پر عمل پیرا ہے۔ جو رہبانیت کے پیروکار تھے، وہ تو توکل کے اسلامی تصور کو مانتے ہیں یعنی اولیت عمل کو، فعالیت کو، جہاد زندگی کو اور جن کا تصور عمل پیہم تھا وہ انہیں اصولوں پر جینے مرنے والوں کے مزاروں پر مکھیاں مارنے کو توکل سمجھ بیٹھے۔ اپنی بے عملی، تساہل، جہالت، لاعلمی، جمود، فقر، غربت، بے وقعتی اور ذلت، غرض کہ اپنی نادانی اور حماقت کو بھی خدا کی مشیت گردان کے کسی مجرہ کے توکل میں منتظر فرما دیں یہ مسلمان! تو پھر قرآن کی اس آیت کا کیا ہوگا، جس کا مفہوم اقبال نے کچھ یوں بیان کیا تھا کہ:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ جو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

ہمارا دین اور ہماری سمجھ، ہماری روحانیت اور ایمانی قوت، چند ڈھکوسلوں اور خرافات تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہماری دینی شناخت کرتے، پا جائے میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ پانچ سو سال پرانے منطق و فلسفہ کی گردان کر کے اسے دینی فلسفہ کا درجہ دے چکے ہیں اور اپنے عہد کے تقاضوں، فکروں، فلسفوں کو سمجھنے سے گریزاں ہیں۔ ملت و طبقتوں میں بنٹ گئی ہے۔ 'علمائے دین'، 'دانشوران عصر' کو فاسق و فاجر سے کم درجہ دینے پر آمادہ نہیں اور یہ روشن فکر دنیاوی دانشور 'دقیقہ نوی علمائے دین' کو اچھوت سے زیادہ ارفع مقام نہ دینے پر بضد ہیں اور حق یہ ہے کہ دونوں عموماً غلط فہمیوں کا شکار۔ افہام و تفہیم کے بجائے تحزیب و تقسیم ہمارا مذہب بن چکا ہے۔ ہم ہر چیز کو تقسیم کرنے پر آمادہ ہیں، اس لئے ہر جگہ تحزیب کا شکار اور المیہ تو یہ ہے کہ تقسیم کا یہ سارا عمل دین کے نام پر ہو رہا ہے۔ خلافت کی تقسیم، مملکتوں کی تقسیم، پھر گروہوں کی تقسیم، غرض کہ تقسیم کا یہ سلسلہ بڑھ کر زندگی تک پہنچ گیا ہے۔ اب زندگی دنیاوی اور دینی زندگی میں تقسیم ہو گئی ہے اور یہی نہیں اسی طرح انہیں خطوط پر علم بھی تقسیم ہو گیا ہے۔ اسی سبب ایک طبقہ دین کے نام پر اندھیروں میں گم ہے اور دوسرا دنیا کے نام پر ظلمتوں میں غرق۔ جس مذہب نے دنیا کے امور کو بھی دین کا حصہ بنایا، وہاں آج رہبانیت کا میٹھا زہر دین تصور کیا جا رہا ہے، جس مذہب نے کائنات کی اسرار کشائی کا حکم دیا گیا، وہاں آج جہالت کی حکمرانی ہے، جو مذہب دنیا کے ہر خطے، قوم، زبان، فرقے کو گلے لگانے آیا تھا، وہاں انہیں بنیادوں پر کشت و خون کا بازار گرم ہے۔ جس مذہب نے اخلاق کی درنگی، پاکی و صفائی کو دین کی اساس بتایا، اسی کے پیروکار بد اخلاقی، گندگی اور ناپاکی کے مبلغ ہیں، جو رواداری کا نمونہ تھے، وہ ہر بات پر قتال پر آمادہ ہیں، جس مذہب نے اوہام و خرافات کے طوفانوں کو زیر کیا، اسی کے ماننے والے ہر اوہام و خرافات کے مقلد ہیں۔ جس نے مختلف قوموں کو ایک پیچان دی، وہی آج اپنی شناخت سے نابلد ہے۔ اپنا احتساب جن کا شیوہ تھا، وہ اپنی ہر ناکامی کے لئے یا تو دوسروں کو گالیاں دے کے مطمئن ہو جاتے ہیں یا پھر اسے مشیت ایزدی یعنی خدا پر الزام دھر کر اپنی ذمہ داریوں سے ہاتھ جھاڑ لیتے ہیں۔

ان سب پر المیہ یہ کہ سچ جاننے والے سچ بولنے سے گریزاں ہیں

بقیہ: قصہ غرائق حقیقت یا افسانہ؟

کہ آپ صرف ہمارے ان بتوں کی جانب رخ کر دیں تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے مگر اس حضور ﷺ نے ان کی اس پیشکش کو ٹھکرادیا، جو ذات گرامی بتوں کی جانب ایک لمحہ کے لئے رخ کرنے کو تیار نہیں، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنی زبان سے بتوں کی مدح سرائی اور ثنا خوانی کرے گی؟ جبکہ خود اسی سورہ مبارکہ کے آغاز میں اللہ رب العزت نے اپنے حبیب کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ میرا محبوب اپنی خواہش نفس سے کچھ نہیں بولتا، رب کا فرمان عالی شان ہے ”و النجم اذا هوى۔ ماضل صاحبکم و ماغوی و ما ينطق عن الهوى ان هو الا وحی یوحی، علمہ شدید القوی“ قسم ہے اس ستارے کی جب وہ نیچے اترے، تمہارا زندگی بھر کا ساتھی نہ راہ حق سے بھٹکا اور نہ بہکا اور وہ تو بولتا ہی نہیں اپنی خواہش سے، نہیں ہے یہ مگر وحی جو ان کی طرف کی جاتی ہے، انہیں کھایا ہے زبردست قوتوں والے نے۔ (النجم: ۱-۵) ہمارے قارئین اب خود فیصلہ کریں کہ اللہ کا فرمان سچا ہے یا یہ روایت جو زندیقوں کی وضع کردہ ہے۔ نہ زیادہ دور اور نہ ہی زیادہ دیر بھٹکنے کی ضرورت ہے بلکہ اگر آپ بغور صرف اسی سورہ مبارکہ ہی کو پڑھ لیں تو مستشرقین کے اسلام کے خلاف افسانہ طرازی کا بھر مکمل کر آپ کے سامنے آجائے گا۔ بفرض محال ایک لمحہ کے لئے اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے بتوں کی تعریف کی اور انہیں شفع جاننا، تو کیا اس تضاد کو عقل سلیم ماننے کو تیار ہوگی کہ اس کے فوراً ہی بعد دوسری آیت میں آپ نے بتوں کی مذمت کی ہو، اور ان کے بارے میں فرمایا: ”ان ہی الا اسماء سمیتموھا انتم و آبائکم ما انزل اللہ بھا من سلطان ان یتبعون الا الظن و ما تهوی الانفس“ یعنی نہیں ہیں یہ مگر محض نام۔ جو رکھ لئے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادا نے، نہیں نازل کی اللہ نے ان کے بارے میں سند نہیں پیروی کر رہے یہ لوگ مگر گمان کی، اور جسے ان کے نفس چاہتے ہیں، کیا ان آیات میں کوئی باہمی مناسبت ہے؟ کیا ایسا بے ربط کلام اُضحی العرب ﷺ کی زبان سے ادا ہو سکتا ہے؟ اور اگر ان دو جملوں کو سن کر کفار کو خوشی ہوئی تھی تو اس کے فوراً بعد یہ آیتیں سن کر حضور ﷺ کے بارے میں ان کی خوش فہمیاں ہمیشہ کے لئے کافور نہیں ہو گئی ہوگی؟ ایک ادنیٰ عقل فہم کا مالک انسان اس روایت کو صحیح تسلیم کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہو سکتا۔ □□

یا خوفزدہ۔ کچھ لوگ ہمت کرتے ہیں تو ہر چار دانگ سے اٹھ رہی بھانت بھانت کی آوازوں میں ان کی آواز گم ہو جاتی ہے۔ جن کی سنی جاسکتی ہے وہ بولتے نہیں اور جو سننے یا سنانے کے لائق نہیں، ہر جگہ ان کی آوازیں سنائی پڑتیں ہیں۔ جو سمجھتے ہیں، وہ نا سمجھوں سے دور ہیں اور جو نا سمجھ ہیں، انہیں سمجھنے کی نہ طلب ہے، نہ احساس۔ جو رہنما ہیں، انہیں عوام سے کوئی تعلق نہیں اور نہ عوام میں غلط رہنماؤں سے کنارہ کشی کا رویہ۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ سچ بولا جائے اور خوف و ترس کی چادر اتار کر سچ بولنے والوں کی آواز میں آواز ملائی جائے۔ سچ کی تلاش کی جائے اور اس پر عمل پیرا ہو یا جائے۔ صرف یہودیوں کو گالی دیکر یا شیطان پر انزام دھر کے یا توکل کا حوالہ دے کر ہم اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برائتیں ہو سکتے۔ ہمیں اپنے دن بدلنے کے لئے خود ہی ہاتھ پاؤں مارنے ہونگے، خود ہی تعلیم کی طرف بڑھنا ہوگا، خود ہی اپنی آواز اٹھانی ہوگی اور خود ہی اپنے وجود کا احساس دلانا ہوگا۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ہر رواج دین نہیں ہوتا اور ہر اشاعت شدہ خبر سچی نہیں ہوتی اور یہ بھی کہ خدا کا نام لے لینے سے ہر عمل جائز نہیں ہو جاتا۔ کامیاب وہی ہے، جو شکست کو فتح میں بدل دے۔

اسی طرح ہر ڈگری یافتہ تعلیم یافتہ نہیں ہوتا۔ تعلیم یافتہ وہی ہے، جو نہ صرف آگاہ ہے بلکہ اپنی نا آگاہیوں سے بھی واقف ہے اور اس کے حصول کے لئے کوشاں بھی۔

جب کہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہر روایت اور عادت کو بلا تحقیق و جستجو مذہب تصور کئے بیٹھے ہیں اور ہر نئی چیز کو فتنہ قرار دینے پر آمادہ، خواہ وہ سائنسی ایجاد و انکشاف انسانیت کے لئے کتنا ہی مفید کیوں نہ ہو۔

مذہب کا راگ الاپتی ہر آواز پر بنا سوچے سمجھے لیک کہہ اٹھتے ہیں، جہاں ہیں، ڈرے، سہمے اور قنوطیت و ناامیدی کا شکار اور کچھ کرنے یا کسی عمل سے خود کو دور رکھے ہوئے اپنی اپنی قباؤں میں پنہاں۔ تعلیم جو ان سب کا حل ہے، اس سے کوسوں دور اور نتیجتاً زندگی کے ہر شعبے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے بجائے، گریزاں اور کنارہ جو۔ نفرتوں کا شکار اور اپنوں ہی سے دشمنی پر آمادہ اور تعصب ایسا کہ اپنا اگر غلط بھی ہو تو اس کے حامی۔ یہ سب تباہی کے عناصر ہیں۔ ایک دوسری کچھ کم نہ تھے، یہاں تو سب کے سب ہیں۔ □□□

سیدنا غوث اعظم کی تاریخ ولادت و وفات سیدنا عبد الوہاب جیلانی کی آمد ہند کا جائزہ

تیسری اور آخری قسط

دستاویزات اور شاہی فرامین

میں ان دستاویزات کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا تھا لیکن ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم مصباحی کے حالیہ مضمون سے اندازہ ہوا کہ ان کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت انھیں دستاویزوں کی ہے۔ لگتا ہے ان کے نزدیک یہ کورٹ، کچہری اور شاہی درباروں کے تمسکات نہیں بلکہ آسمان سے نازل شدہ صحیفے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”ہندوستان میں سلسلہ قادریہ کے اولین مبلغ کوئی دوسرا نہیں خود بانی سلسلہ قادریہ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی کے فرزند ارجمند قطب الہند سیدنا سیف الدین عبدالوہاب جیلانی ہیں۔ جو سلطان الہند خواجہ غریب نواز کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے اور درگاہ بڑے پیر ناگور شریف میں آسودہ خواب ہیں۔ راقم نے اپنے موقف کی تائید میں عام مصنفین کی طرح کتابوں کے حوالوں کو ہی کافی نہیں سمجھا ہے۔ بلکہ اپنے موقف کی تائید میں ”درجنوں دستاویزات و فرامین“ بھی بطور شواہد پیش کیے ہیں۔ (اہل سنت کی آواز جلد ۱۲- ذی قعدہ ۱۴۲۸ھ/ نومبر ۲۰۰۷ء ص ۴۲۸-۴۲۹)“

ہندوستان میں سلسلہ قادریہ کا اولین مبلغ کون ہے؟ بروقت یہ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ سیدنا عبدالوہاب کی آمد ہند حکم غوث اعظم بمرافقت خواجہ غریب نواز اور مدفن ناگور ثابت کرنے کے لیے سرکار غوث اعظم کی تاریخ ولادت و وفات میں تصرف اور تبدیلی کا انجام آپ نے دیکھ لیا۔ سیدنا خواجہ حمیری کی غوث اعظم سے ۵۸۰ھ میں ملاقات اور ایک مکالمے کے بعد سیدنا عبدالوہاب کی معیت پھر سفر ہند اور ناگور میں مدفن کا راز بھی طشت از بام ہو چکا۔ مزید کچھ لکھنا ضروری نہیں۔ لیکن ہمارے ڈاکٹر صاحب کہیں گے کہ ”اصل صحائف“ کو تو آپ نے ہاتھ ہی نہ لگایا۔ دستاویزوں کو غور سے پڑھیے۔ آپ کو سمجھ میں آجائے گا کہ سیدنا عبدالوہاب کا مدفن ناگور ہی میں ہے۔ آئیے دیکھیں ان دستاویزوں میں کیا ہے؟

● ڈاکٹر صاحب نے خود بتا دیا ہے کہ یہ فیصلے یا حکم نامے کس طرح کے ہیں:

[۱] آستانے سے متعلق زمین کے بارے میں باشندگان ناگور اور آستانے کے لوگوں میں کوئی تنازع ہوا، معاملہ کورٹ، کچہری تک پہنچا۔ زمین کا فیصلہ آستانے والوں کے حق میں ہوا۔

[۲] آستانے سے متعلق یومیہ فتوحات اور نذر و نیاز کے سلسلے میں بے ضابطگی ہوئی، معاملہ کچہری یا شاہ وقت تک پہنچا، فیصلہ آستانے والوں کے حق میں ہوا۔

[۳] آستانے کی آراضی کا خسرہ نمبر اور رقبہ کیا ہے؟ ناگور کی کچہری سے خسرہ کی نقل لے کر اس کا عکس شامل کتاب کیا ہے۔

[۴] راجستھان گزٹ میں آستانہ سیدنا عبدالوہاب کا نام درج ہے، اس کا بھی عکس نوادرات میں شامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی وضاحت کر دی ہے کہ یہ سارے دستاویزات اور فرامین ان کو درگاہ بڑے پیر ناگور سے حاصل ہوئے، اصل وہیں محفوظ ہے۔

(تاریخ مشائخ اول ص ۴۳۹ و ۴۴۰)

اب ناظرین خود سمجھ سکتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی زمین یا جائداد سے متعلق اپنی ملکیت یا کسی وقف سے متعلق اپنی تولیت کا دعویٰ رکھتا ہے اور شہادت یا قانونی کاغذات کے ذریعہ حکام کے نزدیک اپنے دعوے کا حق ہونا ثابت کر لے جاتا ہے تو فیصلہ اسی کے حق میں ہوگا۔ اگر کوئی دوسرا اس پر قابض ہو یا بے اجازت مالک یا متولی اس پر رہائش اختیار کرے۔ یا کوئی بھی ناروا تصرف کرے تو حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ اس کو بے دخل کرے اور اسے روکے۔ حکومت کے اوپر صرف اتنی تحقیق کی ذمہ داری ہے کہ زمین کا اصل مالک یا متولی و ذمہ دار کون ہے؟ یہ تحقیق کہ یہ زمین کسی آستانے کی ہے تو صاحب آستانہ کون ہے؟ ان کا نام کیا ہے؟ نسب کیا ہے؟ آیا واجداد کہاں کے تھے؟ اگر بغداد کے تھے تو بغداد میں ان کے مورث اعلیٰ کون تھے؟ پھر ان کے یہ وارث کب بغداد چھوڑ کر یہاں آ گئے؟ کس کے ساتھ آئے؟ کون لایا؟

کا صحیح اندازہ بہت دشوار ہے۔

لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ درگاہ ناگور کے نزاعات سے متعلق جتنی دستاویزیں ڈاکٹر صاحب نے پیش کی ہیں (دیکھیے ص ۴۴۲ تا ۴۷۸) ان میں سے کسی میں سیدنا عبدالوہاب جیلانی کا یا ان کی جانب منسوب مقبرے یا روضے یا درگاہ کا نام و نشان تک نہیں۔ یعنی نہ تو استغاثے میں اس نام سے درگاہ کا ذکر ہے، نہ کسی فیصلے میں، نہ آپسی معاہدے میں۔ اگر کہیں ذکر ہے تو سیدنا عبدالقادر ثانی کا جو سرکار غوث اعظم کے نیچے آٹھویں پشت میں تھے۔ اور شیخ محقق علیہ الرحمہ نے اخبار الاخبار میں ان کا مدفن ”اوپچہ“ (واقع حال پاکستان) میں بتایا ہے۔ اب عرض یہ ہے کہ:

اولاً: میں نے پہلے بیان کیا کہ درگاہ منسوب بہ فلاں بزرگ کی کسی زمین پر کسی غیر کے ناجائز عمل دخل کا استغاثہ ہوا۔ حاکم کو معلوم ہوا کہ واقعہ اس غیر کو اس زمین پر عمل دخل کا حق نہیں۔ اس نے مستغیث کے حق میں فیصلہ یا فرمان جاری کیا اور اس غیر کا عمل دخل ختم کرنے کا حکم صادر کیا۔ تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ درگاہ کا انتساب بجانب فلاں بزرگ بالکل صحیح ہے۔ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ حاکم کی نظر میں اس زمین پر اس غیر کا قبضہ غلط تھا اس لیے اس نے اسے ہٹانے کا حکم جاری کیا۔

ثانیاً: ان دستاویزوں میں درگاہ یا مقبرہ یا روضہ منسوب بہ سیدنا عبدالوہاب جیلانی نہ استغاثے میں لکھا گیا نہ باہمی معاہدے میں، نہ کسی حاکم کے فیصلے میں، نہ کسی بادشاہ کے فرمان میں۔ تو ان دستاویزوں کو ڈاکٹر صاحب نے ناگور میں سیدنا عبدالوہاب جیلانی کا مدفن ہونے کے ثبوت میں کیسے پیش کیا؟ تقریباً چالیس صفحات سیاہ کر کے ناظرین کو ایک خلاف واقع اور غیر مندرج چیز باور کرانے میں ان کا مفاد اور مقصد کیا تھا؟؟ ایسے کاغذات میں روضہ سیدنا عبدالوہاب جیلانی درج ہوتا تو بھی یہ ثبوت نہ بنتا۔ پھر جب ان کے نام کا کہیں اندراج بھی نہیں تو ثبوت کیسے ہو گیا؟

یہ میں یوں ہی نہیں کہتا۔ آپ ذرا تفصیل سے ان دستاویزوں کا جائزہ لیں:

دستاویزوں پر طائرانہ نظر

۱۔ ص ۴۴۲ پروانہ حسن قلی خان۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔ ۱۰۱۔ ۱۰۲۔ ۱۰۳۔ ۱۰۴۔ ۱۰۵۔ ۱۰۶۔ ۱۰۷۔ ۱۰۸۔ ۱۰۹۔ ۱۱۰۔ ۱۱۱۔ ۱۱۲۔ ۱۱۳۔ ۱۱۴۔ ۱۱۵۔ ۱۱۶۔ ۱۱۷۔ ۱۱۸۔ ۱۱۹۔ ۱۲۰۔ ۱۲۱۔ ۱۲۲۔ ۱۲۳۔ ۱۲۴۔ ۱۲۵۔ ۱۲۶۔ ۱۲۷۔ ۱۲۸۔ ۱۲۹۔ ۱۳۰۔ ۱۳۱۔ ۱۳۲۔ ۱۳۳۔ ۱۳۴۔ ۱۳۵۔ ۱۳۶۔ ۱۳۷۔ ۱۳۸۔ ۱۳۹۔ ۱۴۰۔ ۱۴۱۔ ۱۴۲۔ ۱۴۳۔ ۱۴۴۔ ۱۴۵۔ ۱۴۶۔ ۱۴۷۔ ۱۴۸۔ ۱۴۹۔ ۱۵۰۔ ۱۵۱۔ ۱۵۲۔ ۱۵۳۔ ۱۵۴۔ ۱۵۵۔ ۱۵۶۔ ۱۵۷۔ ۱۵۸۔ ۱۵۹۔ ۱۶۰۔ ۱۶۱۔ ۱۶۲۔ ۱۶۳۔ ۱۶۴۔ ۱۶۵۔ ۱۶۶۔ ۱۶۷۔ ۱۶۸۔ ۱۶۹۔ ۱۷۰۔ ۱۷۱۔ ۱۷۲۔ ۱۷۳۔ ۱۷۴۔ ۱۷۵۔ ۱۷۶۔ ۱۷۷۔ ۱۷۸۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ ۱۸۱۔ ۱۸۲۔ ۱۸۳۔ ۱۸۴۔ ۱۸۵۔ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ ۱۸۸۔ ۱۸۹۔ ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ ۱۹۲۔ ۱۹۳۔ ۱۹۴۔ ۱۹۵۔ ۱۹۶۔ ۱۹۷۔ ۱۹۸۔ ۱۹۹۔ ۲۰۰۔ ۲۰۱۔ ۲۰۲۔ ۲۰۳۔ ۲۰۴۔ ۲۰۵۔ ۲۰۶۔ ۲۰۷۔ ۲۰۸۔ ۲۰۹۔ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔ ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ ۲۱۴۔ ۲۱۵۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷۔ ۲۱۸۔ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ ۲۲۲۔ ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ ۲۲۵۔ ۲۲۶۔ ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ ۲۲۹۔ ۲۳۰۔ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ ۲۳۳۔ ۲۳۴۔ ۲۳۵۔ ۲۳۶۔ ۲۳۷۔ ۲۳۸۔ ۲۳۹۔ ۲۴۰۔ ۲۴۱۔ ۲۴۲۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴۔ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ ۲۴۷۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ ۲۵۱۔ ۲۵۲۔ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵۔ ۲۵۶۔ ۲۵۷۔ ۲۵۸۔ ۲۵۹۔ ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ ۲۶۲۔ ۲۶۳۔ ۲۶۴۔ ۲۶۵۔ ۲۶۶۔ ۲۶۷۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ ۲۷۱۔ ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۷۹۔ ۲۸۰۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲۔ ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۸۶۔ ۲۸۷۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۰۲۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳۔ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱۔ ۳۵۲۔ ۳۵۳۔ ۳۵۴۔ ۳۵۵۔ ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ ۳۵۹۔ ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ۳۶۲۔ ۳۶۳۔ ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ ۳۶۶۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۳۶۹۔ ۳۷۰۔ ۳۷۱۔ ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔ ۳۷۶۔ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔ ۳۷۹۔ ۳۸۰۔ ۳۸۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴۔ ۳۸۵۔ ۳۸۶۔ ۳۸۷۔ ۳۸۸۔ ۳۸۹۔ ۳۹۰۔ ۳۹۱۔ ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ ۳۹۴۔ ۳۹۵۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ ۳۹۹۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ ۴۰۲۔ ۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ ۴۰۸۔ ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲۔ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ ۴۱۸۔ ۴۱۹۔ ۴۲۰۔ ۴۲۱۔ ۴۲۲۔ ۴۲۳۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔ ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ ۴۲۸۔ ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ۴۳۱۔ ۴۳۲۔ ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ ۴۳۵۔ ۴۳۶۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ ۴۳۹۔ ۴۴۰۔ ۴۴۱۔ ۴۴۲۔ ۴۴۳۔ ۴۴۴۔ ۴۴۵۔ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹۔ ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ ۴۵۳۔ ۴۵۴۔ ۴۵۵۔ ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹۔ ۴۶۰۔ ۴۶۱۔ ۴۶۲۔ ۴۶۳۔ ۴۶۴۔ ۴۶۵۔ ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ ۴۷۳۔ ۴۷۴۔ ۴۷۵۔ ۴۷۶۔ ۴۷۷۔ ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ۴۸۰۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ ۴۸۴۔ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ ۴۸۷۔ ۴۸۸۔ ۴۸۹۔ ۴۹۰۔ ۴۹۱۔ ۴۹۲۔ ۴۹۳۔ ۴۹۴۔ ۴۹۵۔ ۴۹۶۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸۔ ۴۹۹۔ ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ ۵۰۲۔ ۵۰۳۔ ۵۰۴۔ ۵۰۵۔ ۵۰۶۔ ۵۰۷۔ ۵۰۸۔ ۵۰۹۔ ۵۱۰۔ ۵۱۱۔ ۵۱۲۔ ۵۱۳۔ ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ ۵۱۹۔ ۵۲۰۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۳۔ ۵۲۴۔ ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ ۵۳۱۔ ۵۳۲۔ ۵۳۳۔ ۵۳۴۔ ۵۳۵۔ ۵۳۶۔ ۵۳۷۔ ۵۳۸۔ ۵۳۹۔ ۵۴۰۔ ۵۴۱۔ ۵۴۲۔ ۵۴۳۔ ۵۴۴۔ ۵۴۵۔ ۵۴۶۔ ۵۴۷۔ ۵۴۸۔ ۵۴۹۔ ۵۵۰۔ ۵۵۱۔ ۵۵۲۔ ۵۵۳۔ ۵۵۴۔ ۵۵۵۔ ۵۵۶۔ ۵۵۷۔ ۵۵۸۔ ۵۵۹۔ ۵۶۰۔ ۵۶۱۔ ۵۶۲۔ ۵۶۳۔ ۵۶۴۔ ۵۶۵۔ ۵۶۶۔ ۵۶۷۔ ۵۶۸۔ ۵۶۹۔ ۵۷۰۔ ۵۷۱۔ ۵۷۲۔ ۵۷۳۔ ۵۷۴۔ ۵۷۵۔ ۵۷۶۔ ۵۷۷۔ ۵۷۸۔ ۵۷۹۔ ۵۸۰۔ ۵۸۱۔ ۵۸۲۔ ۵۸۳۔ ۵۸۴۔ ۵۸۵۔ ۵۸۶۔ ۵۸۷۔ ۵۸۸۔ ۵۸۹۔ ۵۹۰۔ ۵۹۱۔ ۵۹۲۔ ۵۹۳۔ ۵۹۴۔ ۵۹۵۔ ۵۹۶۔ ۵۹۷۔ ۵۹۸۔ ۵۹۹۔ ۶۰۰۔ ۶۰۱۔ ۶۰۲۔ ۶۰۳۔ ۶۰۴۔ ۶۰۵۔ ۶۰۶۔ ۶۰۷۔ ۶۰۸۔ ۶۰۹۔ ۶۱۰۔ ۶۱۱۔ ۶۱۲۔ ۶۱۳۔ ۶۱۴۔ ۶۱۵۔ ۶۱۶۔ ۶۱۷۔ ۶۱۸۔ ۶۱۹۔ ۶۲۰۔ ۶۲۱۔ ۶۲۲۔ ۶۲۳۔ ۶۲۴۔ ۶۲۵۔ ۶۲۶۔ ۶۲۷۔ ۶۲۸۔ ۶۲۹۔ ۶۳۰۔ ۶۳۱۔ ۶۳۲۔ ۶۳۳۔ ۶۳۴۔ ۶۳۵۔ ۶۳۶۔ ۶۳۷۔ ۶۳۸۔ ۶۳۹۔ ۶۴۰۔ ۶۴۱۔ ۶۴۲۔ ۶۴۳۔ ۶۴۴۔ ۶۴۵۔ ۶۴۶۔ ۶۴۷۔ ۶۴۸۔ ۶۴۹۔ ۶۵۰۔ ۶۵۱۔ ۶۵۲۔ ۶۵۳۔ ۶۵۴۔ ۶۵۵۔ ۶۵۶۔ ۶۵۷۔ ۶۵۸۔ ۶۵۹۔ ۶۶۰۔ ۶۶۱۔ ۶۶۲۔ ۶۶۳۔ ۶۶۴۔ ۶۶۵۔ ۶۶۶۔ ۶۶۷۔ ۶۶۸۔ ۶۶۹۔ ۶۷۰۔ ۶۷۱۔ ۶۷۲۔ ۶۷۳۔ ۶۷۴۔ ۶۷۵۔ ۶۷۶۔ ۶۷۷۔ ۶۷۸۔ ۶۷۹۔ ۶۸۰۔ ۶۸۱۔ ۶۸۲۔ ۶۸۳۔ ۶۸۴۔ ۶۸۵۔ ۶۸۶۔ ۶۸۷۔ ۶۸۸۔ ۶۸۹۔ ۶۹۰۔ ۶۹۱۔ ۶۹۲۔ ۶۹۳۔ ۶۹۴۔ ۶۹۵۔ ۶۹۶۔ ۶۹۷۔ ۶۹۸۔ ۶۹۹۔ ۷۰۰۔ ۷۰۱۔ ۷۰۲۔ ۷۰۳۔ ۷۰۴۔ ۷۰۵۔ ۷۰۶۔ ۷۰۷۔ ۷۰۸۔ ۷۰۹۔ ۷۱۰۔ ۷۱۱۔ ۷۱۲۔ ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ ۷۱۵۔ ۷۱۶۔ ۷۱۷۔ ۷۱۸۔ ۷۱۹۔ ۷۲۰۔ ۷۲۱۔ ۷۲۲۔ ۷۲۳۔ ۷۲۴۔ ۷۲۵۔ ۷۲۶۔ ۷۲۷۔ ۷۲۸۔ ۷۲۹۔ ۷۳۰۔ ۷۳۱۔ ۷۳۲۔ ۷۳۳۔ ۷۳۴۔ ۷۳۵۔ ۷۳۶۔ ۷۳۷۔ ۷۳۸۔ ۷۳۹۔ ۷۴۰۔ ۷۴۱۔ ۷۴۲۔ ۷۴۳۔ ۷۴۴۔ ۷۴۵۔ ۷۴۶۔ ۷۴۷۔ ۷۴۸۔ ۷۴۹۔ ۷۵۰۔ ۷۵۱۔ ۷۵۲۔ ۷۵۳۔ ۷۵۴۔ ۷۵۵۔ ۷۵۶۔ ۷۵۷۔ ۷۵۸۔ ۷۵۹۔ ۷۶۰۔ ۷۶۱۔ ۷۶۲۔ ۷۶۳۔ ۷۶۴۔ ۷۶۵۔ ۷۶۶۔ ۷۶۷۔ ۷۶۸۔ ۷۶۹۔ ۷۷۰۔ ۷۷۱۔ ۷۷۲۔ ۷۷۳۔ ۷۷۴۔ ۷۷۵۔ ۷۷۶۔ ۷۷۷۔ ۷۷۸۔ ۷۷۹۔ ۷۸۰۔ ۷۸۱۔ ۷۸۲۔ ۷۸۳۔ ۷۸۴۔ ۷۸۵۔ ۷۸۶۔ ۷۸۷۔ ۷۸۸۔ ۷۸۹۔ ۷۹۰۔ ۷۹۱۔ ۷۹۲۔ ۷۹۳۔ ۷۹۴۔ ۷۹۵۔ ۷۹۶۔ ۷۹۷۔ ۷۹۸۔ ۷۹۹۔ ۸۰۰۔ ۸۰۱۔ ۸۰۲۔ ۸۰۳۔ ۸۰۴۔ ۸۰۵۔ ۸۰۶۔ ۸۰۷۔ ۸۰۸۔ ۸۰۹۔ ۸۱۰۔ ۸۱۱۔ ۸۱۲۔ ۸۱۳۔ ۸۱۴۔ ۸۱۵۔ ۸۱۶۔ ۸۱۷۔ ۸۱۸۔ ۸۱۹۔ ۸۲۰۔ ۸۲۱۔ ۸۲۲۔ ۸۲۳۔ ۸۲۴۔ ۸۲۵۔ ۸۲۶۔ ۸۲۷۔ ۸۲۸۔ ۸۲۹۔ ۸۳۰۔ ۸۳۱۔ ۸۳۲۔ ۸۳۳۔ ۸۳۴۔ ۸۳۵۔ ۸۳۶۔ ۸۳۷۔ ۸۳۸۔ ۸۳۹۔ ۸۴۰۔ ۸۴۱۔ ۸۴۲۔ ۸۴۳۔ ۸۴۴۔ ۸۴۵۔ ۸۴۶۔ ۸۴۷۔ ۸۴۸۔ ۸۴۹۔ ۸۵۰۔ ۸۵۱۔ ۸۵۲۔ ۸۵۳۔ ۸۵۴۔ ۸۵۵۔ ۸۵۶۔ ۸۵۷۔ ۸۵۸۔ ۸۵۹۔ ۸۶۰۔ ۸۶۱۔ ۸۶۲۔ ۸۶۳۔ ۸۶۴۔ ۸۶۵۔ ۸۶۶۔ ۸۶۷۔ ۸۶۸۔ ۸۶۹۔ ۸۷۰۔ ۸۷۱۔ ۸۷۲۔ ۸۷۳۔ ۸۷۴۔ ۸۷۵۔ ۸۷۶۔ ۸۷۷۔ ۸۷۸۔ ۸۷۹۔ ۸۸۰۔ ۸۸۱۔ ۸۸۲۔ ۸۸۳۔ ۸۸۴۔ ۸۸۵۔ ۸۸۶۔ ۸۸۷۔ ۸۸۸۔ ۸۸۹۔ ۸۹۰۔ ۸۹۱۔ ۸۹۲۔ ۸۹۳۔ ۸۹۴۔ ۸۹۵۔ ۸۹۶۔ ۸۹۷۔ ۸۹۸۔ ۸۹۹۔ ۹۰۰۔ ۹۰۱۔ ۹۰۲۔ ۹۰۳۔ ۹۰۴۔ ۹۰۵۔ ۹۰۶۔ ۹۰۷۔ ۹۰۸۔ ۹۰۹۔ ۹۱۰۔ ۹۱۱۔ ۹۱۲۔ ۹۱۳۔ ۹۱۴۔ ۹۱۵۔ ۹۱۶۔ ۹۱۷۔ ۹۱۸۔ ۹۱۹۔ ۹۲۰۔ ۹۲۱۔ ۹۲۲۔ ۹۲۳۔ ۹۲۴۔ ۹۲۵۔ ۹۲۶۔ ۹۲۷۔ ۹۲۸۔ ۹۲۹۔ ۹۳۰۔ ۹۳۱۔ ۹۳۲۔ ۹۳۳۔ ۹۳۴۔ ۹۳۵۔ ۹۳۶۔ ۹۳۷۔ ۹۳۸۔ ۹۳۹۔ ۹۴۰۔ ۹۴۱۔ ۹۴۲۔ ۹۴۳۔ ۹۴۴۔ ۹۴۵۔ ۹۴۶۔ ۹۴۷۔ ۹۴۸۔ ۹۴۹۔ ۹۵۰۔ ۹۵۱۔ ۹۵۲۔ ۹۵۳۔ ۹۵۴۔ ۹۵۵۔ ۹۵۶۔ ۹۵۷۔ ۹۵۸۔ ۹۵۹۔ ۹۶۰۔ ۹۶۱۔ ۹۶۲۔ ۹۶۳۔ ۹۶۴۔ ۹۶۵۔ ۹۶۶۔ ۹۶۷۔ ۹۶۸۔ ۹۶۹۔ ۹۷۰۔ ۹۷۱۔ ۹۷۲۔ ۹۷۳۔ ۹۷۴۔ ۹۷۵۔ ۹۷۶۔ ۹۷۷۔ ۹۷۸۔ ۹۷۹۔ ۹۸۰۔ ۹۸۱۔ ۹۸۲۔ ۹۸۳۔ ۹۸۴۔ ۹۸۵۔ ۹۸۶۔ ۹۸۷۔ ۹۸۸۔ ۹۸۹۔ ۹۹۰۔ ۹۹۱۔ ۹۹۲۔ ۹۹۳۔ ۹۹۴۔ ۹۹۵۔ ۹۹۶۔ ۹۹۷۔ ۹۹۸۔ ۹۹۹۔ ۱۰۰۰۔ ۱۰۰۱۔ ۱۰۰۲۔ ۱۰۰۳۔ ۱۰۰۴۔ ۱۰۰۵۔ ۱۰۰۶۔ ۱۰۰۷۔ ۱۰۰۸۔ ۱۰۰۹۔ ۱۰۱۰۔ ۱۰۱۱۔ ۱۰۱۲۔ ۱۰۱۳۔ ۱۰۱۴۔ ۱۰۱۵۔ ۱۰۱۶۔ ۱۰۱۷۔ ۱۰۱۸۔ ۱۰۱۹۔ ۱۰۲۰۔ ۱۰۲۱۔ ۱۰۲۲۔ ۱۰۲۳۔ ۱۰۲۴۔ ۱۰۲۵۔ ۱۰۲۶۔ ۱۰۲۷۔ ۱۰۲۸۔ ۱۰۲۹۔ ۱۰۳۰۔ ۱۰۳۱۔ ۱۰۳۲۔ ۱۰۳۳۔ ۱۰۳۴۔ ۱۰۳۵۔ ۱۰۳۶۔ ۱۰۳۷۔ ۱۰۳۸۔ ۱۰۳۹۔ ۱۰۴۰۔ ۱۰۴۱۔ ۱۰۴۲۔ ۱۰۴۳۔ ۱۰۴۴۔ ۱۰۴۵۔ ۱۰۴۶۔ ۱۰۴۷۔ ۱۰۴۸۔ ۱۰۴۹۔ ۱۰۵۰۔ ۱۰۵۱۔ ۱۰۵۲۔ ۱۰۵۳۔ ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵۔ ۱۰۵۶۔ ۱۰۵۷۔ ۱۰۵۸۔ ۱۰۵۹۔ ۱۰۶۰۔ ۱۰۶۱۔ ۱۰۶۲۔ ۱۰۶۳۔ ۱۰۶۴۔ ۱۰۶۵۔ ۱۰۶۶۔ ۱۰۶۷۔ ۱۰۶۸۔ ۱۰۶۹۔ ۱۰۷۰۔ ۱۰۷۱۔ ۱۰۷۲۔ ۱۰۷۳۔ ۱۰۷۴۔ ۱۰۷۵۔ ۱۰۷۶۔ ۱۰۷۷۔ ۱۰۷۸۔ ۱۰۷۹۔ ۱۰۸۰۔ ۱۰۸۱۔ ۱۰۸۲۔ ۱۰۸۳۔ ۱۰۸۴۔ ۱۰۸۵۔ ۱۰۸۶۔ ۱۰۸۷۔ ۱۰۸۸۔ ۱۰۸۹۔ ۱۰۹۰۔ ۱۰۹۱۔ ۱۰۹۲۔ ۱۰۹۳۔ ۱۰۹۴۔ ۱۰۹۵۔ ۱۰۹۶۔ ۱۰۹۷۔ ۱۰۹۸۔ ۱۰۹۹۔ ۱۱۰۰۔ ۱۱۰۱۔ ۱۱۰۲۔ ۱۱۰۳۔ ۱۱۰۴۔ ۱۱۰۵۔ ۱۱۰۶۔ ۱۱۰۷۔ ۱۱۰۸۔ ۱۱۰۹۔ ۱۱۱۰۔ ۱۱۱۱۔ ۱۱۱۲۔ ۱۱۱۳۔ ۱۱۱۴۔ ۱۱۱۵۔ ۱۱۱۶۔ ۱۱۱۷۔ ۱۱۱۸۔ ۱۱۱۹۔ ۱۱۲۰۔ ۱۱۲۱۔ ۱۱۲۲۔ ۱۱۲۳۔ ۱۱۲۴۔ ۱۱۲۵۔ ۱۱۲۶۔ ۱۱۲۷۔ ۱۱۲۸۔ ۱۱۲۹۔ ۱۱۳۰۔ ۱۱۳۱۔ ۱۱۳۲۔ ۱۱۳۳۔ ۱۱۳۴۔ ۱۱۳۵۔ ۱۱۳۶۔ ۱۱۳۷۔ ۱۱۳۸۔ ۱۱۳۹۔ ۱۱۴۰۔ ۱۱۴۱۔ ۱۱۴۲۔ ۱۱۴۳۔ ۱۱۴۴۔ ۱۱۴۵۔ ۱۱۴۶۔ ۱۱۴۷۔ ۱۱۴۸۔ ۱۱۴۹۔ ۱۱۵۰۔ ۱۱۵۱۔ ۱۱۵۲۔ ۱۱۵۳۔ ۱۱۵۴۔ ۱۱۵۵۔ ۱۱۵۶۔ ۱۱۵۷۔ ۱۱۵۸۔ ۱۱۵۹۔ ۱۱۶۰۔ ۱۱۶۱۔ ۱۱۶۲۔ ۱۱۶۳۔ ۱۱۶۴۔ ۱۱۶۵۔ ۱۱۶۶۔ ۱۱۶۷۔ ۱۱۶۸۔ ۱۱۶۹۔ ۱۱۷۰۔ ۱۱۷۱۔ ۱۱۷۲۔ ۱۱۷۳۔ ۱۱۷۴۔ ۱۱۷۵۔ ۱۱۷۶۔ ۱۱۷۷۔ ۱۱۷۸۔ ۱۱۷۹۔ ۱۱۸۰۔ ۱۱۸۱۔ ۱۱۸۲۔ ۱۱۸۳۔ ۱۱۸۴۔ ۱۱۸۵۔ ۱۱۸۶۔ ۱۱۸۷۔ ۱۱۸۸۔ ۱۱۸۹۔ ۱۱۹۰۔ ۱۱۹۱۔ ۱۱۹۲۔ ۱۱۹۳۔ ۱۱۹۴۔ ۱۱۹۵۔ ۱۱۹۶۔ ۱۱۹۷۔ ۱۱۹۸۔ ۱۱۹۹۔ ۱۲۰۰۔ ۱۲۰۱۔ ۱۲۰۲۔ ۱۲۰۳۔ ۱۲۰۴۔ ۱۲۰۵۔ ۱۲۰۶۔ ۱۲۰۷۔ ۱۲۰۸۔ ۱۲۰۹۔ ۱۲۱۰۔ ۱۲۱۱۔ ۱۲۱۲۔ ۱۲۱۳۔ ۱۲۱۴۔ ۱۲۱۵۔ ۱۲۱۶۔ ۱۲۱۷۔ ۱۲۱۸۔ ۱۲۱۹۔ ۱۲۲۰۔ ۱۲۲۱۔ ۱۲۲۲۔ ۱۲۲۳۔ ۱۲۲۴۔ ۱۲۲۵۔ ۱۲۲۶۔ ۱۲۲۷۔ ۱۲۲۸۔ ۱۲۲۹۔ ۱۲۳۰۔ ۱۲۳۱۔ ۱۲۳۲۔ ۱۲۳۳۔ ۱۲۳۴۔ ۱۲۳۵۔ ۱۲۳۶۔ ۱۲۳۷۔ ۱۲۳۸۔ ۱۲۳۹۔ ۱۲۴۰۔ ۱۲۴۱۔ ۱۲۴۲۔ ۱۲۴۳۔ ۱۲۴۴۔ ۱۲۴۵۔ ۱۲۴۶۔ ۱۲۴۷۔ ۱۲۴۸۔ ۱۲۴۹۔ ۱۲۵۰۔ ۱۲۵۱۔ ۱۲۵۲۔ ۱۲۵۳۔ ۱۲۵۴۔ ۱۲۵۵۔ ۱۲۵۶۔ ۱۲۵۷۔ ۱۲۵۸۔ ۱۲۵۹۔ ۱۲۶۰۔ ۱۲۶۱۔ ۱۲۶۲۔ ۱۲۶۳۔ ۱۲۶۴۔ ۱۲۶۵۔ ۱۲۶۶۔ ۱۲۶۷۔ ۱۲۶۸۔ ۱۲۶۹۔ ۱۲۷۰۔ ۱۲۷۱۔ ۱۲۷۲۔ ۱۲۷۳۔ ۱۲۷۴۔ ۱۲۷۵۔ ۱۲۷۶۔ ۱۲۷۷۔ ۱۲۷۸۔ ۱۲۷۹۔ ۱۲۸۰۔ ۱۲۸۱۔ ۱۲۸۲۔ ۱۲۸۳۔ ۱۲۸۴۔ ۱۲۸۵۔ ۱۲۸۶۔ ۱۲۸۷۔ ۱۲۸۸۔ ۱۲۸۹۔ ۱۲۹۰۔ ۱۲۹۱۔ ۱۲۹۲۔ ۱۲۹۳۔ ۱۲۹۴۔ ۱۲۹۵۔ ۱۲۹۶۔ ۱۲۹۷۔ ۱۲۹۸۔ ۱۲۹۹۔ ۱۳۰۰۔ ۱۳۰۱۔ ۱۳۰۲۔ ۱۳۰۳۔ ۱۳۰۴۔ ۱۳۰۵۔ ۱۳۰۶۔ ۱۳۰۷۔ ۱۳۰۸۔ ۱۳۰۹۔ ۱۳۱۰۔ ۱۳۱۱۔ ۱۳۱۲۔ ۱۳۱۳۔ ۱۳۱۴۔ ۱۳۱۵۔ ۱۳۱۶۔ ۱۳۱۷۔ ۱۳۱۸۔ ۱۳۱۹۔ ۱۳۲۰۔ ۱۳۲۱۔ ۱۳۲۲۔ ۱۳۲۳۔ ۱۳۲۴۔ ۱۳۲۵۔ ۱۳۲۶۔ ۱۳۲۷۔ ۱۳۲۸۔ ۱۳۲۹۔ ۱۳۳۰۔ ۱۳۳۱۔ ۱۳۳۲۔ ۱۳۳۳۔ ۱۳۳۴۔ ۱۳۳۵۔ ۱۳۳۶۔ ۱۳۳۷۔ ۱۳۳۸۔ ۱۳۳۹۔ ۱۳۴۰۔ ۱۳۴۱۔ ۱۳۴۲۔ ۱۳۴۳۔ ۱۳۴۴۔ ۱۳۴۵۔ ۱۳۴۶۔ ۱۳۴۷۔ ۱۳۴۸۔ ۱۳۴۹۔ ۱۳۵۰۔ ۱۳۵۱۔ ۱۳۵۲۔ ۱۳۵۳۔ ۱۳۵۴۔ ۱۳۵۵۔ ۱۳۵۶۔ ۱۳۵۷۔ ۱۳۵۸۔ ۱۳۵۹۔ ۱۳۶۰۔ ۱۳۶۱۔ ۱۳۶۲۔ ۱۳۶۳۔ ۱۳۶۴۔ ۱۳۶۵۔ ۱۳۶۶۔ ۱۳۶۷۔ ۱۳۶۸۔ ۱۳۶۹۔ ۱۳

● ان دونوں میں یہ حکم ہے کہ حکومت کے سپاہی سیدنا عبدالقادر جیلانی کا روضہ اور مستغیث کی حویلی خالی کر دیں۔ استغاثے میں مطالبہ بھی یہی تھا۔

۳ ص ۴۴۴۔ فرمان محمد اکبر بادشاہ دہلی۔ ۹۷۸ھ۔ اس میں یہ ہے کہ سید مقبول نے اپنی حویلی میں سپاہیوں کی دراندازی سے تکلیف کی شکایت کی۔ سپاہیوں کو سختی سے روکا جائے۔ اس فرمان میں سیدنا عبدالقادر ثانی کے روضہ میں دخل اندازی کا نہ استغاثہ مذکور ہے نہ اس سے متعلق کوئی حکم۔ بلکہ سید مقبول کی ذاتی حویلی سے متعلق فرمان ہے۔ کسی بزرگ کا نام، نشان کچھ بھی نہیں۔

۴ ص ۴۴۶۔ پروانہ میر جلال۔ غالباً ان کے بھائی میر عبد الرحیم حام تھے۔ ان کے نام میر جلال نے سفارشی مکتوب لکھا ہے کہ شیخ غلیل (عرف سید مقبول) نے اپنی حویلی میں شریعت پرستوں کی شرارت کا ذکر کیا۔ تم دفع شر میں اپنی پوری کوشش صرف کرو۔ بہت ثواب پاؤ گے۔ اس میں کسی بزرگ کا نام نہیں۔

۵ ص ۴۴۶۔ پروانہ چاند خاں۔ اس میں سید عبدالقادر ثانی کا نام حاشیہ پر ہے۔ حکم یہ ہے کہ حکام حضرت سید عبدالقادر ثانی کے روضہ اور مستغیث کی حویلی کو سپاہیوں سے خالی کرائیں۔ شعبان ۹۸۲ھ

● غور طلب امر یہ ہے کہ ۹۸۲ھ تک فوجیوں سے روضہ خالی نہ ہوا مگر اکبر بادشاہ کے یہاں دہلی میں ۹۷۸ھ میں جب استغاثہ دائر ہوا تو اس میں سیدنا عبدالقادر ثانی کا نام تک نہ آنے دیا گیا جب کہ اس سے قبل حسن قلی خاں کے یہاں اور بعد میں چاند خاں کے یہاں ان کے روضے کا ذکر کیا گیا۔ آخر وجہ کیا ہے؟ ہو سکتا ہے یہ سوچا ہو کہ اکبر کے زیر نگیں ”اوپر“ بھی ہے ”ناگور“ بھی ہے۔ آج میں ان کا مدفن ہونا بادشاہ کو معلوم ہے یا دوران تفتیش معلوم ہو سکتا ہے۔ اس لیے اگر ناگور میں ان کا روضہ بتایا گیا تو حویلی بھی نہ مل پائے گی۔ واللہ اعلم بالصواب

۶ ص ۴۴۸۔ پروانہ بھیکن خاں ناگوری۔ ربیع الاول ۹۸۷ھ۔ اس میں قطب الاقطاب۔ اس کے بعد جگہ خالی۔ حاشیہ پر میراں سید محی الدین جیو کے لنگر اور معاش کے لیے موضع کھجوانہ بہہ کر کے ان کی اولاد سید مقبول و شیخ کمال کی تحویل میں دینے کا ذکر ہے۔

۷ ص ۴۵۰۔ ۱۲ ربیع الاول ۱۱۱۵ھ (۱۱۱۵ھ) کا ایک محضر نامہ ہے۔ جس کا مضمون یہ ہے کہ دولانا نامی ایک شخص نے سید حامد کی ملکیت

میں سکونت اختیار کر رکھی ہے اور دعویٰ یہ رکھتا ہے کہ یہ زمین سید حامد کی ملکیت نہیں، چار ماہ گزر گئے وہ اپنا دعویٰ ثابت نہ کر سکا اس لیے فیصلہ یہ ہے کہ زمین پر سید حامد ہی کی ملکیت رہے گی۔ اس محضر نامہ کے متن میں کسی بزرگ کا ذکر نہیں۔ حاشیہ پر کچھ عبارت کا اضافہ ہے جس میں سید حامد نبیرہ غوث الثقلین سید عبدالقادر جیلانی تحریر ہے۔ اس محضر نامے کے اوپر دہلی طرف بادشاہ عالمگیر اور راجہ راء سنگھ کی مہریں بھی ہیں۔

۸ ص ۴۵۲۔ یہاں ایک اقرار نامہ یا محضر نامہ ہے جس میں لاد محمد نامی شخص نے لکھا ہے کہ میں جس زمین میں رہتا ہوں وہ سید حامد (جگہ خالی ہے۔ حاشیہ پر حضرت میراں محی الدین درج ہے) کی ملک ہے۔ وہ جب کہیں گے میں خالی کر دوں گا۔ سنہ واضح نہیں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ ۱۲ ربیع الاول ۱۰۲۵ھ کی تحریر ہے۔ لیکن اس پر جوہر ثبت ہے اس میں ۱۰۸۹ھ صاف درج ہے تو واقعہ اس کے بعد کے کسی سنہ کا ہونا چاہیے۔

۹ ص ۴۵۴۔ یہ ۱۰۵۵ھ کی تحریر ہے۔ اس میں خیرات سے ہونے والی آمدنی کا تصرف حسب سابق برقرار رکھنے کا ذکر ہے۔ ایک جگہ لفظ غوث الثقلین ہے اس کے بعد تھوڑی جگہ خالی ہے۔ اس سے پہلے تقریباً ایک سطر جگہ خالی ہے۔ ہو سکتا ہے مٹ گئی ہو یا اتنا کاغذ چھٹ گیا ہو۔

۱۰ ص ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ یہ ۱۰۵۶ھ کی تحریر ہے۔ اس میں سیدنا عبدالقادر ثانی کے افراد خانوادہ کے باہم نذر و نیاز سے متعلق گفتگو کرنے اور اس کی آمدنی آپس میں صحیح طور پر تقسیم کرنے کرانے کا ذکر ہے۔

۱۱ ص ۴۵۹۔ اس میں سیدنا شاہ عبدالرزاق قدس سرہ (متوفی ۹۴۲ھ۔ فرزند سیدنا عبدالقادر ثانی متوفی ۹۳۰ھ) کے آستانے کی نذر و نیاز کے صحیح بنوارے سے متعلق لکھا ہے۔ ۲۵ رشتوال ۱۰۵۷ھ کی تحریر ہے

۱۲ ص ۴۶۱۔ میر سید محمد نبیرہ حضرت غوث الصمدانی اس کے بعد تھوڑی جگہ خالی ہے۔ ایک جگہ حاشیہ پر سید عبدالقادر جیلانی درج ہے [کے موروثی مکان، کوئیں اور باغ واقع ناگور سے متعلق انھیں پریشان نہ کرنے کا حکم تحریر ہے۔ تاریخ: ۲۱ محرم ۱۰۶۶ھ۔

۱۳ ص ۴۶۳۔ تحریر ۳ رذوالحجہ ۱۰۶۸ھ۔ یہ سید حامد ولد سید محمد مرحوم کی ذاتی تحریر ہے۔ جس میں حویلی میں سے ایک کمرہ کی زمین متصل شارع عام درگاہ کے خدمت گزار تاجو ولد چھاچھان بانی کو دینے کا ذکر ہے۔

۱۴ ص ۳۶۵- یہاں اس فرمان کی نقل ہے جو حسب حکم عالم گیر سلطان اورنگ زیب جاری ہوا اس کا مضمون یہ ہے کہ: سید موسیٰ نے استغاثہ کیا تھا کہ سید عبد القادر ثانی اور ان کے بیٹے سید عبد الرزاق کی قبروں کے پیچھے ایک پختہ کواں اور ۱۰۰ گز طول ۸۰ گز عرض میں ایک حویلی ہے جسے ناگور کے کچھ شریکین غصب کرنا چاہتے ہیں۔ حکم دیا گیا ہے کہ انھیں اس پریشانی سے نجات دلائی جائے۔ یہ فرمان ۲۸ محرم کا ہے۔ سنہ واضح نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اھ لکھا ہے تو یہ ۱۱۰۱ھ ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب نے ۵۱ھ متعین کیا ہے مگر عالم گیر کے عہد حکومت ۱۰۶۹ھ تا ۱۱۱۸ھ میں ۵۱ھ نہیں آتا۔

۱۵ ص ۳۶۷- اس میں راجہ رکناتھ سنگھ کا فرمان ہے کہ سید موسیٰ وغیرہ نبیرہ غوث الثقلین نے استغاثہ کیا کہ یہاں کے لوگ چار مسجدوں کی اصلاح و مرمت کرنا چاہتے ہیں مگر کچھ لوگ مزاحم ہیں۔ حکم ہے کہ مزاحمت کرنے والوں کو روکا جائے۔ تحریر ۳ شوال ۱۰۹۹ھ۔ ڈاکٹر صاحب نے ذرا نا صاف ہونے کی وجہ سے ۱۰۶۹ھ متعین کیا ہے لیکن اس پر جو مہر ثبت ہے وہ ۱۰۸۹ھ کی بنی ہوئی ہے تو معاملہ اس کے بعد کسی سن کا ہوگا۔

۱۶ ص ۳۶۹- مقبرہ سیدنا عبد القادر ثانی کے پیچھے واقع حویلی اور کوئیں کو سید حامد کے زیر تصرف برقرار رکھنے سے متعلق حکومت صوبہ اجمیر کا فرمان ہے۔ محرم ۵/ رجب ۱۰۷۵ھ۔

۱۷ ص ۳۷۱- اسی حویلی وغیرہ سے متعلق سلطان عالم گیر کا فرمان ہے۔ تاریخ ۷/ رجب المرجب ۱۰۷۵ھ۔

۱۸ ص ۳۷۳- پروانہ عابد خان۔ اس میں یہ ذکر ہے کہ سید مصطفیٰ نبیرہ سید عبد القادر ثانی پر گنہ ناگور نے بیان کیا کہ روضہ سید عبد القادر ثانی سے متصل جامع مسجد کی امامت زمانہ قدیم سے حافظ معروف کے سپرد تھی اب شاہ محمد نامی ایک شخص نے امامت اور تنخواہ اپنے حق میں کرائی اور سابق امام و مؤذن کو بے دخل کر دیا۔ حکم ہے کہ تحقیق کے بعد جو حق دار ہوا سے حق دلایا جائے۔ تحریر ۱۱ شوال ۱۰۷۷ھ۔

اسی جامع مسجد کی امامت سے متعلق نواب عابد خاں کا ایک پروانہ اسی ۱۰۷۷ھ کے ماہ شعبان کا ص ۵۰۶ پر ہے۔

۱۹ ص ۳۷۵- تحریر ۵/ رجب الآخر ۱۰۸۳ھ۔ یہ سید حامد ولد سید محمد کی ذالی تحریر ہے۔ اس میں درگاہ سید عبد القادر ثانی کے احاطے کا ایک ٹکڑا دولت شاہ کو ہبہ کرنے کا ذکر ہے۔

۲۰ ص ۳۷۷- تحریر ۷/ شوال ۱۰۸۹ھ۔ یہ جوہر خاں کا اقرار نامہ یا عہد نامہ ہے کہ روضہ سیدنا عبد القادر ثانی کے قریب ایک قطعہ زمین مجھے رہنے کو ملا ہے۔ جب سید حامد کا مطالبہ ہوگا میں زمین چھوڑ دوں گا۔

۲۱ ص ۳۷۹- یہ ۲۴/ رجب ۱۰۹۱ھ کا فرمان ہے جس میں درگاہ سیدنا عبد القادر ثانی کے سجادہ نشین سید حامد نبیرہ (غوث الثقلین میران محی الدین عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ) کو کچھ ہدایا و تحائف دینے کا ذکر ہے۔ اس فرمان کا ٹکس بہت نا صاف آیا ہے۔ مہر بھی واضح نہیں۔ قوسین کی عبارت اوپر حاشیے میں ہے۔ میں نے کئی طرح کے آلات سے اسے بغور دیکھا۔ اس میں بھی سیدنا عبد الوہاب جیلانی کا نام کہیں نہیں ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے اس فرمان کا تعارف کراتے ہوئے سیدنا عبد الوہاب جیلانی کا نام دے دیا ہے جیسے انھوں نے ص ۳۷۳ کی دستاویز کا تعارف کراتے ہوئے سیدنا عبد الوہاب جیلانی کا نام لکھ دیا ہے جب کہ ص ۳۷۳ پر مندرج دستاویز کسی آلے کی مدد کے بغیر صاف پڑھی جاسکتی ہے۔ متن یا حاشیہ میں کہیں بھی سیدنا عبد الوہاب جیلانی کا نام نہیں۔

● ناظرین ایک بار پھر دیکھ لیں یہاں تک جو تحریریں نقل ہوئیں ان میں بعض بالکل ذاتی جائداد و زمین سے متعلق ہیں کسی بزرگ کا ان میں نام و نشان نہیں۔ بعض میں ذکر ہے تو سیدنا عبد القادر ثانی کا ذکر ہے۔ سیدنا عبد الوہاب جیلانی کا کہیں ذکر نہیں۔ سیدنا عبد القادر ثانی کے والد واقعہ ہندوستان آئے تھے اور ان کے فرزند سیدنا عبد القادر ثانی ہندوستان ہی کے ہو کر رہ گئے۔ ان کی جانب درگاہ ناگور کے لوگوں نے مقبرے کی اور اپنی نسبت کی۔ استغاثوں میں ان کا ذکر کیا۔ اپنے کواں کی اولاد سے بتانے کی وجہ سے اولاد غوث اعظم سے ہونا بھی بتایا۔ اس لیے کہ سیدنا عبد القادر ثانی واقعہ اولاد غوث اعظم سے تھے۔ ان کے اور سرکار غوث اعظم کے درمیان ۷ پشتوں کا فاصلہ ہے۔ تقریباً ۸۶۲ھ میں پیدا ہوئے ۹۳۰ھ میں وفات پائی۔ مگر ان تحریروں میں اس بات کی کوئی چھان بین اور تفتیش نہیں کہ اہل استغاثہ اپنے کو سیدنا عبد القادر ثانی کی اولاد سے بتا رہے ہیں تو واقعہ یہ ان کی اولاد سے ہیں یا نہیں؟ اور جس مقبرے کو ان کی جانب منسوب کر رکھا ہے وہ واقعہ ان کا مقبرہ ہے یا نہیں؟ سارے نزاعات حویلی وغیرہ سے متعلق تھے۔ ان کے مقابلہ میں جو شخص کھڑا ہوتا یا کھڑا کیا جاتا وہ کوئی ثبوت نہ لاتا۔ یہ لوگ ثبوت لاتے، فیصلہ ان کے حق میں ہو جاتا۔ ساری دستاویزوں کا ماحصل یہی

مشہور ہے اس کی زیارت کی جاتی ہے اور برکت حاصل کی جاتی ہے۔“
 شیخ محقق کا زمانہ سیدنا عبد القادر ثانی کے عصر سے بہت قریب تھا، ان کے پر پوتے یعنی سید موسیٰ (ابن سید حامد ابن سید عبد الرزاق ابن سید عبد القادر ثانی علیہم الرحمہ) شاہ عبد الحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ کے شیخ تھے۔ ہند میں رہ کر ہند ہی میں واقع اپنے شیخ کے جدا جہد کے مدفن سے وہ بے خبر ہیں اور ناگور کی بجائے اسے آج میں سمجھ بیٹھے ہیں اور اسے وہاں کی مشہور و تبرک زیارت گاہ بتا رہے ہیں؟

حالات کہ ان کا کہنا ہے کہ اخبار الاخبار میں احوال میں نے تفتیش اور تنقیح کے بعد لکھے ہیں اور اخبار الاخبار (جس کی تاریخ تکمیل ذکر الالویا ۹۹۹ھ ہے) کی تصنیف کے زمانے میں ان کے شیخ سید موسیٰ علیہ الرحمہ (م ۱۰۰۱ھ) اور خاندان و سلسلہ ارادت کے بھی بے شمار باخبر اور قریبی حضرات موجود تھے مگر شیخ محقق اپنے پیر کے جد گرامی سیدنا عبد القادر ثانی (م ۹۴۰ھ) کا مدفن صحیح طور پر نہ معلوم کر سکے، یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے۔

بہر حال اتنا متعین ہے کہ گیارہویں صدی کے اواخر تک ناگور میں سید عبد القادر ثانی علیہ الرحمہ کا روضہ ہونے کو ہی شہرت دی گئی۔ صحیح یا غلط۔ اس وقت تک سیدنا عبد الوہاب جیلانی کا مدفن وہاں بتانے کی بات کسی کے ذہن میں نہ تھی۔ نہ کہیں ان کا نام آتا تھا۔ بعد میں یہ خیال آیا کہ زمانہ کے آگے بڑھنے کے ساتھ ہمیں بھی آگے بڑھنا چاہیے۔ پس وہاں سرکار غوث اعظم رضی اللہ عنہ کے خاص فرزند صلیبی سیدنا عبد الوہاب جیلانی کا مدفن ہونے کو شہرت دی گئی۔ اس بارے میں صاحب سجادہ کے قلم سے ایک دلچسپ کتاب بھی معرض وجود میں آئی۔ دیگر مصنفین کی بھی خدمات حاصل کی گئیں۔ آگے چل کر اس میں بڑی حد تک کامیابی بھی ملی۔ اس نام سے حکومت کے بہت سے محکموں میں درگاہ کا اندراج ہو گیا۔ اوقاف میں بھی نام آ گیا۔ راجستھان گزٹ میں بھی نام آ گیا۔ زمین و جائداد کا بھی اندراج خسرہ میں ہو گیا۔ یہاں تک کہ ناگور تحصیل میں ۱۹۹۷ء میں جو مقدمہ دائر ہوا اور اس کا فیصلہ ہوا اس میں سیدنا عبد الوہاب جیلانی کا تذکرہ آ گیا ہے۔ حاکم نے بیان فریقین کی تفصیل بتاتے ہوئے یہ ذکر کر دیا ہے کہ سید ذوالفقار علی سے سید عبد الوہاب جیلانی کا مقبرہ بتاتے ہیں۔ اور بیسویں صدی کے اواخر کے کچھ رسالے اور کتاب سلسلہ قادریہ کا بانی کون؟ ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں جن سے ان کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ مگر اصل مقدمہ یہ نہ تھا، مقدمہ یہ تھا

ہے۔ زمین و جائداد کی ملکیت کا جھگڑا اپنانے کے لیے اس چھان بین کی ضرورت بھی نہیں تھی کہ یہ کس بزرگ کی اولاد سے ہیں۔ صرف پروانہ حسن قلی خاں میں حویلی کے ساتھ سیدنا عبد القادر ثانی کے روضے میں بھی سپاہیوں کی بے جا رہائش کا تذکرہ ہے، مگر اکبر بادشاہ کے یہاں جو استغاثہ ہوا اس میں روضے کا کوئی ذکر نہیں صرف ذاتی حویلی کا استغاثہ ہے، بہر حال روضہ رہا ہو یا صرف حویلی رہی ہو اگر کوئی شخص کسی ایسی جگہ رہتا ہے جسے دوسرا شخص اپنی حویلی یا اپنے بزرگ کا روضہ بتاتا ہے اور فریق مخالف اپنی سکونت کا قانونی جواز ثابت کرنے سے قاصر رہتا ہے تو یقیناً اسے بے دخل کرنے کا فرمان جاری ہوگا۔

● لیکن میرے نزدیک یہ بھی غور طلب ہے کہ ناگور میں سیدنا عبد القادر ثانی کا بھی مدفن ہے یا نہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے ص ۳۰۸ و ۳۰۹ پر لکھا ہے ”شمس الدین خاں والی ناگور متوفی ۲ شعبان ۹۵۰ھ نے ناگور کے اندر اپنی زندگی ہی میں ایک مقبرہ اپنے شیخ سیدنا عبد القادر ثانی کے لیے، دوسرا اس کے بانیوں کے لیے تیار کرایا تھا۔ یہ دوسرا کالے گنبد کے نام سے مشہور ہے اس میں شمس الدین خاں والی ناگور کی قبر ہے۔“ اتنی۔

شیخ محقق علیہ الرحمہ کی صراحت کے مطابق سیدنا عبد القادر ثانی کا وصال ۹۴۰ھ میں آج واقع حال پاکستان قریب ملتان میں ہوا۔ وہیں ان کا مدفن ہے۔ اس کے پیش نظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناگور میں جو روضہ ان کے لیے بناتھا وہ خالی رہ گیا۔ والی ناگور کے انتقال کے بعد حکومت کے فوجیوں نے حاکم کے مکان اور اس خالی روضے سب پر قبضہ جمالیا۔

شیخ محقق شاہ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (ولادت ۹۵۸ھ۔ وفات ۱۰۵۲ھ) سیدنا عبد القادر ثانی ابن سیدنا محمد حسینی جیلانی کے حالات میں اخبار الاخبار کے اندر تحریر فرماتے ہیں:

”سن شریف حضرت مخدوم ثانی ہفتاد و ہشت سال، و وفات او ہجری ۹۴۰ھ ربیع الاول ۴۰۰ھ و تسع مائة۔ و مقبرہ شریف اور مقام اوچہ مشہور است۔ یزار و یتبرک بہ“ (ص ۲۰۵۔ اشاعت فاروقی اکیڈمی خیر پور پاکستان عکس طبع قدیم)

”حضرت مخدوم ثانی کی عمر شریف ۸۷ سال تھی۔ ۱۸ ربیع الاول ۹۴۰ھ میں وفات پائی۔ اوچہ (اوج) میں ان کا مقبرہ شریف

سے رکھا ہوا ہے اور محقق حضرات کو اس کی زیارت کرائی جاتی ہے تاکہ یہ ثبوت فراہم ہو کہ سیدنا عبد الوہاب کا مدفن ناگور ہے۔ اگرچہ اس تحریر میں ناگور کا نام نہیں۔ یہ لکھا ہے کہ ان کی قبر ہندوستان میں ہے۔ ہندوستان میں ہونے کے لیے ناگور میں ہونا کیا ضروری ہے؟ یہ فرض صدق وہ ہندوستان کے کسی بھی مقام پر ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے ناگور میں نہ ہو میڑتا میں ہو۔ رسم الخط دیکھیے۔

لیلتہ۔ خمسمایتہ۔ قبر میں ایک ایک شوشہ بڑھا ہوا ہے۔ سنہ بتاتے ہوئے تسعین سے قبل و بعد دو جگہ ”و“ غائب ہے۔ جملہ دیکھیے۔ از دنیا و وفات یافتہ۔ تو کسی طرح گوارا کیا جاسکتا ہے مگر ”از رحلت حضرت عبد القادر، بعد چند سال، جانب ہندوستان اقامت (بمعنی سفر) کردند“ کا جواب نہیں۔

اور سب سے اہم یہ کہ نہ کتاب معلوم، نہ زمانہ کتابت معلوم، نہ مقام کتابت معلوم پھر بھی اسے شامل کتاب کیا گیا ہے اور عنوان لکھا گیا ہے ”ناور مخطوطہ کا عکس“

● کچھ دستاویزیں اور ہیں اگر یکسر ان کا ذکر نہ ہو تو اندیشہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ جن کا تذکرہ چھوڑ دیا انہی میں تو سیدنا عبد الوہاب جیلانی کا مقبرہ ناگور میں ہونے کی صراحت تھی۔ اس لیے ذرا صبر اور دل پر جبر کے ساتھ انہیں بھی دیکھ لیں۔

۲۲ ص ۲۸۱۔ یہ فرمان ناگور سے متعلق نہیں۔ قصبہ میڑتا سے متعلق ہے۔ وہاں سیدنا عبد الوہاب جیلانی فرزند حقیقی سرکار غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے منسوب خافقاہ، مقبرہ اور سید موسیٰ مرحوم کی حویلی وغیرہ کی حدود درج کی گئی ہیں۔

یہ ۵ ذی قعدہ ۴۴۲ جلوس عالم گیر (۱۰۶۹ھ = ۳۳ + ۱۱۱۲ھ) یعنی بارہویں صدی ہجری کی دوسری دہائی کا فرمان ہے۔

۲۳ ص ۲۸۳۔ یہ فرمان بھی میڑتا سے متعلق ہے۔ اس لیے کہ اس میں سید محمد ولد سید محمد موسیٰ سجادہ نشین خافقاہ سیدنا عبد الوہاب جیلانی کا ذکر ہے۔ مضمون یہ ہے کہ سید محمد یاد الہی میں مشغول رہتے ہیں موضع کھجوانہ جسے اکبر بادشاہ نے خدام کے لشکر میں صرف کرنے کے لیے بطور جاگیر دیا تھا اس کو عاملوں نے اپنے قبضہ اور خرچ میں لے لیا ہے پھر اسے لشکر کے لیے واگزار کرایا جائے۔ اسی کے مطابق واگزاری اور محصولات سے معافی کا حکم جاری ہوا۔ یہ محمد شاہ کے جلوس ۳، ۲۷

کہ ایک شخص نے دعویٰ کیا تھا کہ ”درگاہ کی زمین و جائداد قدیم زمانے کے ایک حاکم ناگور شمس الدین خاں کی ہے وہ لاؤلفوت ہوئے اس لیے درگاہ سے متعلق قبرستان اور دیگر زمین و جائداد کو حکومت کی ملکیت بنالیا جائے۔“ مگر اس جائداد کا اندراج وقف کے کاغذات میں ہو چکا تھا اور کم از کم قبرستان وہاں ہونا تو معاینہ سے بھی ظاہر تھا اور خود مدعی نے بھی لکھا تھا کہ یہاں کسی بزرگ کا مزار نہیں، یہ خاں زادوں کا قبرستان ہے۔ یعنی والی ناگور شمس الدین خاں کے اہل خاندان یہاں دفن ہوتے تھے اس لیے حاکم نے فیصلہ کیا کہ ایسی زمین جس میں قبرستان ہے اور وقف میں اندراج بھی ہے، اسے حکومت کی ملک بنانے کا کوئی جواز نہیں۔ اس نے پہلے ہی اسٹیج پر دعویٰ خارج کر دیا۔ تاریخ مشائخ قادر یہ جلد اول کے اندر ص ۳۷۵ تا ۳۸۲ تک اس فیصلے کا عکس دیا گیا ہے۔

یہ فیصلہ پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ تاریخ نگری کا یہ کتنا عجیب و غریب اور دل خراش باب ہے کہ تین سو سال کے بعد ایک غلط بات خاصے بڑے پیمانے پر سچ مان لی جاتی ہے لیکن کسی محقق کے لیے بہر حال ضروری ہے کہ وہ دستاویزوں کو غور سے پڑھے اور ان کے متن اور بطن سے جو سچ صورت حال ظاہر ہو رہی ہو بیان کرے۔ اگر وہ فریب خوردہ ہو گیا تو عام دنیا کا کیا حال ہوگا؟

دستاویزوں سے متعلق ڈاکٹر صاحب کی (اگر دانستہ فریب دہی نہیں تو) سادہ لوحی کی دلیل وہ پہلی تحریر ہے جس کا ابھی تک ذکر نہ آیا۔ وہ غیر سرکاری ہے اس لیے یہاں اس کا تذکرہ زیادہ ضروری ہے۔ دیکھیے ص ۴۳۱۔ یہاں ڈھائی ڈھائی انچ میں تقریباً ساڑھے پانچ سطریں فارسی زبان میں ہیں۔ اصل عبارت یہ ہے۔

”شیخ سیف الدین عبد الوہاب از رحلت حضرت عبد القادر بعد چند سال جانب ہندستان اقامت کردند و تاریخ لیلۃ الخامس من شہر شوال سنہ ثلث تسعین خمسمایتہ از دنیا و وفات یافتہ کہ قبر اور ہندستانست“ (کذا فی الاصل)

زبان بھی ماشاء اللہ اور مضمون تو سبحان اللہ! اس پر ڈاکٹر صاحب نے عنوان لکھا ہے۔ ”ناور مخطوطہ کا عکس“۔

کون کا تب ہے؟ کس وقت، کس تاریخ، کس ماہ و سنہ میں، کس مقام پر لکھا گیا؟ یا کہاں سے دست یاب ہوا؟ کچھ پتہ نہیں۔ مگر حفاظت

ربیع الاول یعنی ۱۱۳۲ھ بارہویں صدی کی چوتھی دہائی کا فرمان ہے۔
(محمد شاہ: حکومت ذی قعدہ ۱۱۳۱ھ / ستمبر ۱۷۱۹ء۔ جمادی
الاولیٰ ۱۱۶۱ھ / اپریل ۱۷۴۸ء)

۲۲ یہ فرمان بھی میثرائے متعلق ہے۔ ابتدا ہی اس جملے سے ہے
”متصدیان مہمات حال واستقبال پرگنہ میثرائے تابع سرکار ناگور
بداند“ اور مضمون یہ کہ وہی سید محمد ولد سید محمد موسیٰ سجادگی ترک کر کے
یاد الہی میں مشغول رہتے ہیں۔ شہر مذکور کی جامع مسجد کی دوکانوں کا کرایہ
ان کے متعلقین کی مدد معاش کے لیے جس طرح ملتا تھا پھر دلا جائے۔
یہ فرمان ۲۶ جمادی الاولیٰ ۱۱۳۵ھ جلوس محمد شاہ یعنی ۱۱۳۵ھ کا ہے۔
اس میں بھی سید محمد کا ذکر خاندان نشین خانقاہ سیدنا عبدالوہاب جیلانی فرزند
غوث الثقلین کی حیثیت سے ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ص ۲۸۱-۲۸۳-۲۸۵ کے فرمانوں کو ناگور
کے کھاتے میں ڈال دیا ہے اور ص ۲۸۷ کے فرمان سے میثرائے کا ذکر شروع کیا
ہے۔ جب کہ ص ۲۸۱ و ص ۲۸۵ پر میثرائے کا نام صاف پڑھا جاسکتا ہے۔

۲۵ ص ۲۸۷-۱۱۲۸ھ کی تحریر ہے جو شاہ آیتہ اللہ محکم الدین
کی طرف سے ہے۔ نیچے ان کے اور گواہان کے دستخط ہیں۔ گواہان
تقریباً پچاس ہیں۔ اوپر قاضی شرع سید محمد دائم کی مہر ہے۔ یہ بہ نامہ
ہے جس کی رجسٹری قصبہ میثرائے سرکار ناگور صوبہ اجمیر کی عدالت شریعہ
میں ہوئی ہے۔ مضمون یہ ہے کہ ”زبدۃ الواصلین قدوة العارفین حضرت
سید سیف الدین عبدالوہاب فرزند رشید غوث صدیقی محبوب سبحانی
حضرت سید عبدالقادر جیلانی کا ایک منزلہ چلہ ہے جس میں تین دالان
کی عمارت مع ستون میں نے اپنے خرچ سے تیار کرائی اور کچھ دوسری
چیزیں ہیں ان سب کو میں نے سید محمد وارث و سید ولی محمد فرزند ان سید محمد
ولد سید محمد موسیٰ جیلانی نبیرۃ زبدۃ السالکین کو ہبہ کر کے قابض و مالک بنا
دیا۔ اگر ہمارے برادران، اقارب، یا سید موسیٰ کے دیگر فرزندان یا سید
حامد مرحوم کے فرزندان میں سے کوئی اس کا دعویٰ کرے تو وہ عند الشریع
نامقبول و نامسموع ہوگا۔“

۲۶ ص ۲۸۹-۱۲۴۱ھ جمادی الآخرہ ۱۱۳۶ھ جلوس محمد شاہ-۱۱۳۶ھ روز
جمعہ کی تحریر ہے۔ جس میں کچھ جائداد آمدنی کو ہبہ کر کے مالک و قابض
بنانے کا ذکر ہے۔ ہبہ کرنے والے سید آدم ولد سید محمد ولد سید غلیل اللہ
جیلانی ہیں۔ جن کو ہبہ کیا وہ سید محمد علی ولد مرحوم سید محمد موسیٰ ابن سید محمد

جیلانی ہیں۔ جو چیزیں ہبہ کیں وہ یہ ہیں [۱] رہائشی زمین با عمارت و
بلا عمارت جس میں ایک کمرہ، ایک ایوان مسقف سنگین، ایک قطعہ اقدادہ
زمین مع چوبترہ، زرعی زمین موافق حصہ موضع اتہاس پرگنہ ایندائہ،
روزیہ چھ تنگہ سے اپنا حصہ، روضہ متبرکہ حضرت برہان العارفین، تاج
الحقین ہندگی حضرت شاہ عبدالوہاب فرزند حقیقی حضرت شاہ عبدالقادر
جیلانی کی آمد نذر و نیاز جو وراثۃ و ملکات و اہب مذکور کو ملتی رہی ہے۔

۲۷ ص ۳۹۱-تحریر ۲۵ شوال ۱۱۶۷ھ-یہ سید فاضل بن عبد
القادر اور ان کے فرزندان کی جانب سے درگاہ سید عبدالقادر جیلانی ناگور
کی آمدنی وصول کرنے اور سید فخر الدین کے پاس بھیجے رہنے سے متعلق
معادہ و اقرار ہے۔ اس میں متبن یا حاشیہ میں کہیں بھی سیدنا عبدالوہاب
جیلانی کا نام نہیں۔

۲۸ ص ۳۹۳-یہاں عکس بہت ناصاف آیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب
کی توضیح کے مطابق یہ ۱۲۰۸ھ یعنی تیرہویں صدی کی پہلی دہائی کی تحریر
ہے۔ سید خواجہ بخش ولد سید فخر الدین کے فرزند سید احمد علی نے خادمان
درگاہ اجمیر معلیٰ سے سوال کیا ہے کہ ہم لوگ اولاد غوث اعظم سے ہیں یا
اولاد خواجہ اجمیری سے؟ ان میں سے چند حضرات نے جواب دیا ہے
اور اپنے دست خط ثبت کیے ہیں کہ یہ اولاد غوث اعظم سے ہیں۔ پھر ان
میں سے بعض نے یہ بھی تصدیق کی ہے کہ سیدنا سیف الدین عبد
الوہاب جیلانی علیہ الرحمہ کا مزار مقدس ناگور میں ہے۔

● ظاہر ہے کہ خواجہ اجمیری کی اولاد سے مان کر اپنے یہاں
حصہ دار بنانے سے آسان یہ ہے کہ ان کے دعوے کے مطابق انھیں
غوث اعظم کی اولاد سے مان لیا جائے اور جہاں ان کا عمل دخل ہے
وہیں رہنے دیا جائے اور بالکل یہ دونوں سے انکار کر کے اپنے لیے
پریشانی کا دروازہ نہ کھولا جائے۔

۲۹ ص ۳۹۶-یہ کوئی دستاویز نہیں۔ ۱۲۳۹ھ تیرہویں صدی کی
چوتھی دہائی کے اختتام کے قریب چند قصاب حضرات کو ایک قطعہ زمین
دی گئی ہے اور ان سے یہ لکھوایا گیا ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد سے یہ سنتے
آئے ہیں کہ سیدنا سیف الدین اکبر بغداد سے اپنے والد ماجد سیدنا شیخ
عبدالقادر جیلانی کی اجازت سے خواجہ خواجگان حضرت خواجہ معین
الدین قدس سرہ کے ہمراہ اجمیر تشریف لائے اور وہاں سے سوا لکھ جنگل
جہاں اس وقت ناگور آباد ہے ورود فرمایا اور پردہ فرمانے کے بعد

دارالالحاجات جہاں اس وقت آپ کا روضہ مقدسہ ہے مدفون ہوئے۔

یعنی وہی بات جو زبانی طور پر پھیلائی گئی اور جواہر الاعمال وغیرہ اختراعی کتابوں کے ذریعہ مشہور کی گئی، ان قصاب حضرات کی زبانی کچھ اور باتوں کے اضافے کے ساتھ انھیں زمین دے کر لکھوائی گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے بھی تاریخی دستاویزوں کی فہرست میں شامل کر لیا ہے۔

۳۰ ص ۵۰۰۔ جب تیرہویں صدی نصف کے قریب پہنچنے والی ہے اس وقت تاریخ ۷ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۷ھ کو ایک شیخ نامہ تحریر کیا گیا ہے۔ جس میں بہت سے حضرات نے دستخط کیے ہیں۔

مضمون یہ ہے کہ ”گیارہویں شریف کے موقع پر یہاں درگاہ سیدنا عبد الوہاب و سیدنا عبد القادر ثانی کے پاس جس قدر روشنی اور چراغاں ہم نے دیکھا کسی دوسری جگہ نہ دیکھا۔ اسے ہم اس لیے تحریر میں لائے کہ عندالحاجت کام آئے۔“

یعنی یہ پنجایت کر کے لکھنے کی تو کوئی بات نہ تھی مگر درگاہ والوں نے اپنی کسی قانونی بچت یا ثبوت کے لیے اسے تحریر کر لیا۔ واللہ اعلم بالصواب پھر ہمارے ڈاکٹر صاحب نے اسے بھی تاریخی دستاویزوں کی صف میں درج کر لیا۔ ظاہر ہے کہ اس پر ڈیڑھ سو سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا۔ اب بھی یہ تاریخی دستاویز نہ ہوگی تو کب ہوگی؟

۳۱ ص ۵۰۲۔ یہ مہاراجہ ناگور کی شان میں نثری قصیدہ مدحیہ ہے جسے پیر زادہ خواجہ بخش احمد علی نے نامعلوم تاریخ میں تصنیف کیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ گزربسر کے لیے کوئی قریہ بطور جاگیر عنایت ہو۔ خلاصہ یہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کی کچھ مدحیہ عبارتیں بھی نقل کی ہیں۔ انھیں وہیں دیکھیں۔ ص ۵۰۳۔

۳۲ ص ۵۰۴۔ بقول ڈاکٹر صاحب یہ دستاویز ناقص الطرفین ہے۔ جو حصہ نقل ہوا ہے اس میں سیدنا عبد الوہاب جیلانی یا سیدنا عبد القادر ثانی کے مدفن کا کوئی ذکر نہیں۔ نہ کاتب کا نام ہے، نہ کتابت کی تاریخ دن۔ مگر دستاویزوں کی قطار میں اضافے کا سامان ہے۔

۳۳ ص ۵۰۶۔ پروانہ نواب عابد خاں۔ تاریخ ۷ شعبان ۱۰۷۷ھ مطابق ۱۰۷۷ھ

تقریباً اسی مضمون کا پروانہ نواب عابد خاں ص ۳۷۳ پر بھی ہے۔ وہ ۱۱ اشوال ۱۰۷۷ھ کا ہے یہ اس سے دو ماہ قبل ۷ شعبان کا ہے۔ اس میں سید مصطفیٰ کا استغاثہ ہے۔ اس میں سید عیسیٰ شاگرد حافظ معروف کا

استغاثہ ہے۔ اس میں یہ ہے کہ عمر نامی شخص امامت اور تنخواہ غصب کرنا چاہتا ہے۔ اس میں یہ ہے کہ شاہ محمد نامی شخص نے غصب کر کے سابق امام اور مؤذن کو بے دخل کر دیا۔ دونوں میں روضہ سید عبد القادر ثانی سے متصل جامع مسجد کا اور سابق امام کی حیثیت سے حافظ معروف کا ذکر ہے۔ فیصلہ یہی ہے کہ بعد تفتیش جو حق دار ہوا اسے حق دیا جائے۔ وہاں معاملہ حل نہ ہو تو طرفین کو ہمارے پاس بھیجا جائے۔

۳۴ ص ۵۰۸۔ یہ کوئی دستاویز نہیں۔ نہ کورٹ کچہری کا کاغذ ہے، نہ باہمی شیخ نامہ۔ نہ اس پر کاتب کا نام ہے، نہ کتابت کی تاریخ اور سنہ ہے۔ اوپر لکھا ہے ”نقل مطابق اصل“ مضمون وہی ہے جو ڈاکٹر صاحب ص ۳۶۸ و ۳۶۹ پر اور اس سے کچھ پہلے جواہر الاعمال قلمی کے حوالے سے لکھ آئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے درگاہ والوں میں سے کسی شخص نے یہ صفحہ اسی کتاب سے نقل کر کے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو دکھایا تو انھوں نے شاہی فرامین اور احکام حکام کی دستاویزات میں اسے بھی شامل کر لیا۔ جواہر الاعمال کا ہر صفحہ اگر اسی لائن میں شامل کر لیا جاتا تو حصہ دستاویزات کی ضخامت میں کئی گنا کا اضافہ ہوتا اور ”درجنوں“ کی جگہ ”سیکڑوں“ کہنے کا موقع بھی ہاتھ آتا۔

۳۵ ص ۵۱۱۔ یہ ۷ ارذوالحجہ ۱۱۵۵ھ (غالباً ۱۱۱۵ھ) کا فرمان حاکم ناگور کرنا تھا سگھ کے نام ہے صاحب فرمان کی مہر یا نام کہیں واضح نہیں۔ مضمون یہ ہے کہ ”سید حامد کے خدام نے خبر دی کہ سید حامد کارہاٹی مکان قاضی محمد صادق اور دوست محمد نے سہارا کر دیا۔ اگر ایسا ہی ہے تو انھیں دارالخیرہ امیر کی عدالت میں بھیجا جائے۔“

سیدنا عبد الوہاب یا سیدنا عبد القادر ثانی کا نام متن یا حاشیہ میں کہیں بھی نہیں۔

۳۶ ص ۵۱۳۔ یہ عنایت خان جیو کا پروانہ ہے۔ جو ۶ اشوال ۲۹ھ (غالباً ۱۲۲۹ھ) کو اندر سگھ حاکم ناگور کے نام تحریر ہوا۔ مضمون یہ ہے کہ ”قدوة السالکین شاہ عبد الوہاب سیف الدین کے پوتوں میں سے سید حامد کے متعلقین میں سے ایک شخص نے آکر بیان کیا کہ انھیں پرگنہ ناگور کے محصول سے چار سگھ یومیہ زمانہ قدیم سے ملتا تھا جس کی سند بھی ان کے پاس ہے۔ کچھ دنوں سے یہ بند ہو گیا ہے۔ حکم یہ ہے کہ سند دیکھنے کے بعد حسب سابق اسے جاری کیا جائے۔“

۳۷ ص ۵۱۵۔ یہ اردو زبان میں ۱۰ رمضان ۱۲۶۶ھ کی تحریر

ہے۔ مضمون یہ ہے کہ ”حضرت شاہ عبدالوہاب بن سید عبدالقادر جیلانی کی اولاد سے ہم سارے بھائی شہر ناگور کے رہنے والے ہیں۔ بسبب معاش دلی، میرٹھ، جودھ پور، جاورہ وغیرہ میں منتشر ہو رہے ہیں۔ مگر درگاہ میں ہر ایک کا حصہ ثابت ہے۔“

۳۸ ص ۵۱۶۔ یہ کوئی دستاویز نہیں۔ کسی کی دستی تحریر ہے جس پر ایک مہر بھی ثبت ہے۔ جو مضمون بخط عربی نمایاں ہے بعینہ وہی ہے جو ص ۴۰۸ پر ڈاکٹر صاحب جواہر الاعمال کے حوالے سے لکھ آئے ہیں۔ اور اس کا غلط ہونا بھی بیان کیا ہے۔ اس طرح کہ ”اس میں مسجد کی تعمیر دولت خاں کے عہد میں بدست سید عبدالقادر ثانی بتاریخ ۱۰۱۰ رجب ۷۰۶ھ ہونا درج ہے۔ اولاً: یہ تاریخ سید عبدالقادر ثانی کی ولادت سے ڈیڑھ سو سال پہلے کی ہے تو ان کے ہاتھ سے بنیاد رکھے جانے کا کوئی معنی نہیں۔ ثانیاً: دولت خاں کا زمانہ حکومت ۸۱۶-۸۱۷ھ ہے اس سے بھی مطابقت نہیں، سو سال سے زیادہ کا فرق ہے“ (یہ انہی کی تحریر کا حاصل ہے)۔

وہی مضمون کسی نے جواہر الاعمال سے مع دیگر حکایات و اشعار نقل کر کے الگ رکھ دیا تو ڈاکٹر صاحب نے اسے دستاویزوں کی فہرست میں شامل کر لیا۔ وہ بھی یہ ثابت کرنے کے لیے کہ سیدنا عبدالوہاب کا مدفن ناگور میں ہے۔ جب کہ ان کا اس تحریر میں کوئی ذکر بھی نہیں۔ جو بات اس میں درج ہے وہ تو ثابت نہیں۔ پھر جو سرے سے درج ہی نہیں اس کے ثبوت کی توقع سادگی کی انتہا ہے۔

۳۹ ص ۵۱۹۔ یہ مہاراجہ ناگور کے نام ایک درخواست کا مضمون ہے۔ جس میں آداب و القاب کے بعد یہ اظہار ہے کہ ”حقائق و معارف آگاہ سید محمد فاضل و سید احمد وغیرہ اولاد غوث اعظم کی سکونت آبا و اجداد سے ناگور میں ہے۔ بعض اوباش روضہ مبارکہ کی زمین میں دخل انداز ہیں انھیں مداخلت سے روکا جائے۔“

اس میں صاحب روضہ کسی بزرگ کا نام نہیں، نہ درخواست دینے والے کا دستخط ہے نہ نام و تاریخ۔ یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ درخواست مہاراجہ کے یہاں پیش ہوئی یا بصورت مسودہ لکھی گئی اور درگاہ میں ہی رہ گئی؟ کوئی مقصد اس سے حل نہیں ہوتا۔ مگر درگاہ میں بحفاظت رکھی ہوئی تھی اس لیے دستاویزوں کی فہرست میں شامل کر لی گئی۔

۴۰ ص ۵۲۱۔ یہاں ایک تحریر کا عکس ہے جس کے بارے میں یہ

بیان کیا گیا ہے کہ سرکار بغداد سے ۱۳۲۶ھ میں ناگور تشریف لانے والے سید محمد بن سید محمد ابراہیم بغدادی نے یہ تحریر سید حسن علی سجادہ نشین ناگور کو دی تھی۔ یہ تحریر ڈاکٹر صاحب ص ۳۶۴-۳۶۵ پر جمعہ نقل کر چکے ہیں اور ص ۳۶۶ پر خود بتایا ہے کہ اس کے اندر سیدنا عبدالوہاب جیلانی کا مدفن ناگور میں ہونے کا ذکر نہیں۔ ہاں صاحب سجادہ کے اولاد غوث اعظم سے ہونے کی صراحت ہے۔“

اگرچہ ہمیں اس تحریر میں اور بھی کلام ہے لیکن اصل مقصود جب اس میں مذکور ہی نہیں تو مزید گفتگو کی ضرورت بھی نہیں۔

۴۱ ص ۵۲۳۔ یہاں جودھ پور کے راجہ کا فرمان مارواڑی زبان میں ۱۸۹۴ء و کرم کا لکھا ہوا ہے جس میں ناگور کے پیر زادہ کو سالانہ کچھ رقم دیے جانے کا ذکر ہے۔

اصل مدعا سے اس کا بھی تعلق نہیں۔

۴۲ ص ۵۲۵۔ یہاں خانقاہ کی آراضی خسرو نمبر ۱۲۸/۲ کی نقل ہے، جو صیوث کھٹونی موضع ناگور پر گنہ ریاست جودھ پور ملک مارواڑ ۱۹۵۲ء (۱۳۷۱ھ) کی ہے جس میں آراضی کا اندراج نکیہ سیدنا عبد الوہاب کے نام سے ہے۔

بارہویں صدی سے تگ و دو کرتے کرتے اگر چودھویں صدی کے ستر سال گزرنے کے بعد اپنے حسب مشائنام سے زمین کا اندراج کرالیا گیا تو اس سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ چھٹی صدی کے آخر سے ہی وہاں سیدنا عبد الوہاب جیلانی کا مزار واقعہ موجود ہے۔ حکمہ وقف وغیرہ کے اندراجات بھی چودھویں صدی ہجری/بیسویں صدی عیسوی میں ہی رونما ہوئے ہیں۔ ایسی کارروائیوں سے وہی لوگ فریفتہ ہو سکتے ہیں جنہیں کچھ خبر نہ ہو کہ ذاتی کوششوں سے کاغذات میں کیسی کیسی بے بنیاد باتیں درج ہو جاتی ہیں اور مقدمات میں کام آتی ہیں۔

نمبر ۴۲ آخری دستاویز ہے۔ نمبر ۲۲ تا نمبر ۴۲ پر ایک بار پھر اجمالی نظر ڈال لیں:

نمبر ۲۲ تا ۲۶ کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

نمبر ۲۷ ایک آپسی معاہدہ ہے جس میں اگر نام ہے تو سیدنا عبد القادر ثانی کا۔ سیدنا عبد الوہاب کا نہیں۔ نمبر ۲۸ تیرہویں صدی میں آپسی سوال و جواب پر مشتمل ہے۔ نمبر ۲۹ زمین دے کر قصا بوں سے لکھائی ہوئی ایک حسب مشائخ تحریر ہے۔ نمبر ۳۰ بھی تیرہویں صدی کے

وسط میں عوام سے لکھائی ہوئی ایک حسب مطلب تحریر ہے۔ نمبر ۳۱ میں راجہ سے جاگیر کا سوال ہے۔ کسی روئے یا مقبرے کا ذکر نہیں۔ نمبر ۳۲ کا دستاویزوں میں اندراج ہی ہے۔ نمبر ۳۳ میں اگر ذکر آیا ہے تو روضہ سیدنا عبدالقادر ثانی کا۔ نمبر ۳۴ کسی کتاب سے نقل کیا ہوا ایک صفحہ ہے۔ اسے حکام و شہان کے احکام کی صف میں رکھنا ہی غلط ہے۔ نمبر ۳۵ میں کسی روئے کا ذکر نہیں۔ نمبر ۳۶ ایک آپسی تحریر ہے جو تیرہویں صدی کے نصف آخر میں تیار ہوئی۔ نمبر ۳۸ کسی کتاب سے نقل شدہ ایک دستی تحریر ہے۔ جس کے مضمون کا رد خود تاریخ مشائخ قادریہ ص ۴۰۸ پر ہو چکا ہے۔ نمبر ۳۹ کی حیثیت دستاویز تو کیا اس خط کے برابر بھی نہیں جس پر کاتب کے نام اور تاریخ و سنہ کا اندراج رہتا ہے۔ نمبر ۴۰ سے بھی مدعا ثابت نہیں جیسا کہ ص ۳۶۶ میں خود لکھ آئے ہیں۔ نمبر ۴۱ میں کسی روئے کا تذکرہ نہیں۔ تحریر بھی بارہویں صدی ہجری کے بعد کی ہے۔ نمبر ۴۲ بیسویں صدی عیسوی میں زمین کا اندراج ہے جس پر کلام ہو چکا۔ نمبر ۳۶ میں سیدنا عبد الوہاب جیلانی کا ذکر ہے لیکن سید حامد جن کا مقدمہ ہے معلوم نہیں وہ ناگور والے ہیں یا میڑتا والے؟ ہمارے نزدیک راجہ ثانی ہے۔ آپ کے نزدیک اول راجہ ہو تو بھی یہ تیرہویں صدی کی تحریر ہے۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ گیارہویں صدی کے اواخر تک۔ اور زیادہ محتاط الفاظ میں گیارہویں صدی کی نوں دہائی کے آخر تک۔ ناگور والوں نے خود بھی سیدنا عبدالوہاب رضی اللہ عنہ کا مدفن اپنے یہاں ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ دسویں صدی کے آخری رُخ سے گیارہویں صدی کے اواخر تک تقریباً ۱۲۵ سال وہ یہی یقین دلاتے رہ گئے کہ یہاں سیدنا عبدالقادر ثانی اور ان کے فرزند سیدنا عبدالرزاق رضی اللہ عنہما کے مزارات ہیں۔ کاغذات میں زمین جائداد کے نزاعات میں کسی طرح اگر نام آیا ہے تو انہیں حضرات کا آیا ہے۔ سیدنا عبد الوہاب رضی اللہ عنہ کا ذکر اس زمانے کی کسی تحریر میں نہیں۔

اب اس معنی کو آپ ہی حل کریں کہ سیدنا عبد الوہاب رضی اللہ عنہ کی وفات سیدنا عبدالقادر ثانی سے تقریباً ساڑھے تین سو سال پہلے ہے تو ان کا مدفن بھی پہلے ہوگا۔ اس لیے اس مدفن کا ذکر بھی ساڑھے تین سو سال پہلے سے ہونا چاہیے نہ کہ روضہ سیدنا عبدالقادر ثانی کے بھی پونے دو سو سال بعد۔ اور سیدنا عبد الوہاب رضی اللہ عنہ کی تاریخ وصال ۵۹۳ھ سے تقریباً سو پانچ سو سال بعد۔ آخر اتنی لمبی صدیوں

تک ناگور کے خانگی یا سرکاری کاغذات میں ان کے روضہ و خانقاہ کا ذکر کیوں نہیں آیا؟؟

نمبر ۲۲ میں سیدنا عبد الوہاب جیلانی کی خانقاہ اور مقبرہ دونوں کا ذکر آیا ہے پھر خانقاہ مع حویلی سید موسیٰ کی حدود اور بعد بیان کی گئی ہیں۔ یہ فرمان بارہویں صدی کی دوسری دہائی ۱۱۱۵ھ کا ہے۔ مگر خانقاہ و مقبرہ کا محل وقوع ناگور کو نہیں بلکہ میڑتا کو بتایا ہے۔

نمبر ۲۳-۱۱۳۳ھ بارہویں صدی کی چوتھی دہائی کا ہے۔ موضع کجوان کی آمدنی خدام کو دینے کا حکم ہے اور یہ میڑتا سے متعلق ہے۔ اس لیے کہ اس میں سید محمد ولد سید محمد موسیٰ سجادہ نشین خانقاہ سیدنا عبد الوہاب جیلانی کا ذکر ہے۔

نمبر ۲۴ بھی میڑتا سے متعلق ہے۔ اور ۱۱۳۵ھ کا ہے۔ نمبر ۲۵: ۱۱۲۸ھ کی تحریر ہے اس میں سیدنا عبد الوہاب جیلانی کا چلہ میڑتا میں ہونے کا ذکر آیا ہے

نمبر ۲۶: ایک ہبہ نامہ ہے۔ یہ بھی میڑتا سے متعلق ہے اور سال تحریر ۱۱۳۶ھ ہے۔ اس میں روضہ سیدنا عبد الوہاب جیلانی کا ذکر آیا ہے۔ یہ صرف پانچ دستاویزیں جن میں سیدنا عبد الوہاب جیلانی کا ذکر آیا ہے۔ اسی طرح ایک اور ہے جس کا ذکر نمبر ۳۶ کے تحت ہے اور یہ متعین نہیں کہ وہ میڑتا سے متعلق ہے یا ناگور سے؟ ہمارے نزدیک وہ بھی میڑتا ہی سے متعلق ہے اور یہ سب بارہویں صدی کی دستاویزیں ہیں۔ اب عرض یہ ہے کہ:

(۱) پانچ دستاویزیں جو واضح طور پر میڑتا سے متعلق ہیں انہیں ناگور کے اندر سیدنا عبد الوہاب جیلانی کا مدفن ہونے کے ثبوت میں کیوں پیش کیا گیا؟

(۲) ان میں ایک دستاویز میں تو چلہ کا ذکر ہے۔ نمبر ۲۶ میں روضہ کا ذکر ہے۔ نمبر ۲۲ میں خانقاہ و مقبرہ دونوں لفظ مرکب ہیں۔ نمبر ۲۳، ۲۴، ۲۵ نمبر ۲۵ میں سجادہ نشین خانقاہ سیدنا عبد الوہاب جیلانی لکھا ہے۔

ہمارے نزدیک تو اس طرح کی دستاویزیں جو زمین و جائداد کی حدود اور بعد یا خانقاہ کے نام سے شہرت کی وجہ سے سرکاری امداد دیے جانے یا باہم جائدادوں کے ہبہ و منتقلی سے متعلق ہیں اور ان میں کسی بزرگ سے منسوب مقبرے کا ذکر استغاثے یا سوال میں مذکور ہونے کی وجہ سے آگیا ہے ان سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ واقع میں بھی اس بزرگ

کا وہاں مدفن ہے خصوصاً ایسے وقت جبکہ اس کے برخلاف مستند تاریخی شہادتیں موجود ہوں۔ مگر آپ کے نزدیک اس طرح کسی مدفن، مقبرے اور خانقاہ کا تذکرہ کسی سرکاری یا خانگی کاغذ میں آجانا اتنا قوی اور یقینی و قطعی ثبوت ہے کہ مستند تاریخی حوالوں سے بالاتر ہے اور تمام قدیم کتب تذکرہ کورد کرنے کے لیے کافی و دافی ہے۔ تو آپ بتائیں یہ دستاویزیں جب میڑتا میں سیدنا عبد الوہاب جیلانی کا مقبرہ ذکر کر رہی ہیں تو وہاں ان کا مقبرہ ہے یا نہیں؟ اگر میڑتا میں ان کا مقبرہ ہے تو ناگور میں کیسے ہو سکتا ہے؟ جب کہ بارہویں صدی سے قبل کسی خانگی قرار داد میں بھی ان کا مدفن ناگور میں ہونا مذکور نہیں۔

(۳) اور اگر بلا دستاویز محض جو اہر الاموال، خلاصۃ الامور جیسی اختراعی کتابوں کی بنیاد پر ان کا مقبرہ ناگور میں ماننا تھا تو ان بے ثبوت دستاویزوں کی نمائش سے کیا فائدہ؟

(۴) کیا وجہ ہے کہ بارہویں صدی سے پہلے سرکاری یا خانگی کسی دستاویز میں سیدنا عبد الوہاب جیلانی کا مدفن ناگور میں مذکور نہیں ہوتا۔ اور بارہویں صدی آنے کے بعد بعض غیر سرکاری کاغذات میں ان کا مدفن ناگور میں ہونے کا ذکر شروع ہو جاتا ہے؟ کیا گیارہویں صدی تک اس سے بے خبری تھی، بارہویں صدی میں اچانک انکشاف ہو گیا؟ یا معاملہ کچھ اور ہے؟

(۵) آپ کے طور پر تو میڑتا اور ناگور دونوں جگہ ایک ہی شخصیت کا مقبرہ ہو سکتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:-

”سیدنا سیف الدین عبد الوہاب جیلانی کے علاوہ اور بھی ایسے اولیاء اللہ ہیں جن کے مزارات کی دو جگہ نشان دہی کی جاتی ہے۔ ”کہیں تو واقعی ایسا ہے“ اور کہیں لا علمی میں ایسا ہوا ہے۔“ (ض ۳۵۱- اہل سنت کی آواز- جلد ۱۳- نومبر ۲۰۰۷ء)

لا علمی میں جو کچھ ہوا اس سے ہمیں بحث نہیں۔ ”کہیں تو واقعی ایسا ہے“ یہ ارشاد غور طلب ہے۔ اگر اس کا کوئی بہت دقیق معنی اور منطق سے بعید مفہوم ہے تو وہ ”در بطن شاعر“ ہے۔ متبادر معنی اور ظاہر مطلب یہی ہے کہ دو جگہ مزار بیان کیا گیا اور واقع میں بھی ایسا ہی ہے۔ اگر اسے ذرا سی وسعت دے کر ”تین“ بنادیں تو سارا اختلاف ہی ختم ہو جائے۔ سیدنا عبد الوہاب جیلانی کا مزار بغداد میں بھی ہے۔ میڑتا میں بھی ہے اور آخر میں ناگور کے اندر بھی ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے۔

ہوتا آیا ہے۔ مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔۔۔۔۔ (۶) میڑتا میں سیدنا عبد الوہاب جیلانی کے چلے اور روضہ و خانقاہ کی عقدہ کشائی ڈاکٹر صاحب کے ذمہ ہے۔ چلے کی داستان تو وہ جو اہر الاموال کے حوالے سے نقل کر کے مطمئن ہو گئے مگر روضہ و خانقاہ اور مقبرہ جو ان کے پیش کردہ ”صحائف عالیہ“ میں مذکور ہے اس کا حل بھی ان کی ذمہ داری ہے۔

جہاں تک مجھے علم ہے اس وقت میڑتا والے اپنے یہاں سیدنا عبد الوہاب جیلانی کا روضہ ہونے کے مدعی نہیں۔ ہو سکتا ہے بارہویں صدی کے ربح اول میں یہ دعویٰ رہا ہو جسے دیکھ کر ناگور کو جوش آیا اور اس نے اس دعویٰ کو اپنے یہاں منتقل کر لیا۔ بے چارہ میڑتا قصبہ اپنے شہر کے مقابلے میں ٹک نہ سکا۔ شہر غالب آ گیا پھر شہر نے اپنے دعوے کی شہرت کے لیے ایسے ایسے ذرائع استعمال کیے کہ کم از کم قرب و جوار کے عوام میں سو سال یا کچھ زیادہ عرصہ گزرتے گزرتے اسے تسلیم کر لیا گیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد حکومت کے کاغذات میں بھی اندراج ہو گیا۔ پہلے پہل ان مہمات میں کامیابی کا ایک خاص سبب یہ بھی ہوا کہ مقابلے میں شمس الدین خاں والی ناگور کا کوئی وارث نہ رہا۔ دوسرے جو لوگ سامنے آئے وہ نہ ان جائیدادوں کے مالک تھے اور نہ ہی وہ ان پر اپنی یا کسی اور کی ملکیت ثابت کرنے میں کسی طرح کامیاب ہو سکے۔

● دستاویزوں کی صف میں جو کچھ دکھایا گیا تھا اس کا جائزہ مکمل ہوا۔ حاصل یہ نکلا کہ جسے بہت بڑا ثبوت سمجھ کر پیش کیا گیا تھا وہ کوئی چھوٹا ثبوت بھی نہیں۔

دستاویزوں کی لائن سے الگ درمیان کتاب ایک فارسی مکتوب کا عکس مع اردو ترجمہ بڑی اہمیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس پر اگر کچھ کلام نہ ہوا تو خیال ہو گا کہ یہ نقد و نظر سے بالاتر ہے۔ اس لیے اس کی جانب بھی تھوڑی توجہ کا طالب ہوں۔

دیکھیے ص ۳۶۳۔ یہاں سید عبد اللہ احمد قادری سجادہ نشین بغداد کی جانب منسوب ایک مکتوب کا عکس دیا گیا ہے۔ جس پر ربح الاول ۱۱۹۱ھ درج ہے۔ اس کے ترجمے میں یہ مضمون ہے:

”کچھ لوگ منافق قسم کے جو حضور غوث پاک کے منکر ہیں شیطانوں کے پاس رہنے کی وجہ سے بغض و حسد اور کینہ ہم سے رکھتے ہیں اور عداوت سے جل کر کہتے ہیں کہ جناب قطب الاقطاب سید عبد

الوہاب صاحب فرزند حضور غوث پاک شہر ناگور میں نہیں آئے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ عبد الوہاب دوسرے ہیں، غوث پاک کی اولاد میں سے نہیں ہیں۔ (آگے یہ ہے کہ) ”بغداد میں سب لوگ جانتے ہیں کہ میرے دادا سیف الدین عبد الوہاب شہر ناگور میں آرام فرما ہیں۔“ (ترجمہ بر صفحہ ۳۶۱)

اس مکتوب میں ہمیں بوجہ کلام ہے:

(۱) صاحب سجادہ کی زبان عربی تھی یہ پورا مکتوب فارسی میں ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ایران و ہند کا دورہ کرنے کے لیے انھوں نے فارسی میں بھی دست گاہ حاصل کر لی تھی۔ مگر رسم الخط ہندوستانی انداز کا ہے۔ طرز بیان بھی ہندوستانی۔ زبان بھی خالص ہندوستانی فارسی۔ ایرانی فارسی سے اسے کوئی مناسبت نہیں۔

میری تنقید پر آپ کو اعتبار نہ ہوگا لیکن کسی منصف، زبان داں، اسلوب شناس اور تنقیدی نگاہ والے کو دکھائیے وہ آپ کو سمجھا دے گا۔ (۲) اس کی آخری سطر یوں ہے ”والسلام علی اہل طبع اللہ تعالیٰ“ تحریر ربیع الاول ۱۱۹۱ ہجری۔

مانا کہ انھوں نے فارسی میں دست گاہ حاصل کر لی تھی لیکن عربی سے اتنے نا بلند تو نہ ہوں گے کہ من اتبع الہدی کو من الہدی لکھ ڈالیں اور عاشور یا دہم ربیع الاول کی جگہ عشر ربیع الاول لکھیں؟ (علی ا) اور عمر سے صرف نظر ہے کہ اس طرح تحریر شکستہ میں ہو سکتا ہے۔

(۳) اس میں یہ ذکر ہے کہ ”بغداد میں سب لوگ جانتے ہیں کہ سیدنا عبد الوہاب ناگور میں آسودہ خواب ہیں۔“

لیکن ڈاکٹر صاحب نے ص ۳۵۲ پر بغداد کے ایک بہت باخبر اسکالر کی بات نقل کی ہے کہ:

سیدنا عبد الوہاب علیہ الرحمہ کے مدفن سے متعلق انھیں کچھ علم نہیں۔ ”اہل سنت کی آواز ص ۳۳۹ پر بغداد کے صاحب سجادہ کی گفتگو نقل کی ہے کہ انھیں بھی اس بارے میں کچھ علم نہیں۔ تاریخ مشائخ قادریہ اول ص ۳۵۸ پر یہ ہے کہ ناگور کے کچھ لوگوں نے دہلی میں واقع عراقی سفارت خانے سے رابطہ قائم کیا تو انھوں نے لکھ دیا کہ سیدنا عبد الوہاب کا مزار مقدس بغداد میں ہے۔“

(اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کے توسط سے درگاہ ناگور کے لوگوں نے کہا ہوگا کہ ان کا مدفن تو ناگور میں ہے آپ نے بغداد میں کیسے بتا

دیا؟ تو دوبارہ انھوں نے لکھا کہ ”ہو سکتا ہے کہ ان کے نام کا کوئی دوسرا آدمی وہاں دفن ہو چوں کہ حضرت عبد القادر جیلانی کے کچھ بزرگ وہاں دفن ہیں اس لیے ہم نے سوچا کہ حضرت سیدنا سیف الدین عبد الوہاب کا مزار بھی وہاں ہوگا۔ ہماری اطلاع صحیح نہیں۔“

الغرض ناگور میں ان کے مدفن پر اتنی بحث کی گئی اور ایسا یقین دلایا گیا کہ وہ بے چارے یہ بھی نہ کہہ سکے کہ ہو سکتا ہے ناگور میں اس نام کا کوئی اور مدفن ہو۔ اُلٹے یہ کہہ گئے کہ ”ہو سکتا ہے بغداد میں اس نام کا کوئی اور دفن ہو۔“

ص ۳۶۰ پر لکھا ہے کہ ایک مستند عالم دین حضرت مولانا شاہ عبد الحمید محمد سالم قادری سجادہ نشین آستانہ عالیہ قادریہ مولوی محلہ بدایوں جو بلاناغہ ہر سال بغداد شریف گیا رہیوں شریف کے موقع پر حاضری دیتے ہیں اور آستانہ عالیہ قادریہ ہی میں سجادہ نشین کے مہمان ہوتے ہیں وہ اپنے مکتوب ۱۳ جولائی ۱۹۹۵ء میں لکھتے ہیں ”بغداد شریف حاضری ہوئی وہاں حضرت سیدنا عبد الوہاب جیلانی کے مزار سے متعلق کسی کو صحیح معلوم نہیں۔“ یہی بات ص ۳۵۲ پر ان سے زبانی گفتگو کے حوالے سے لکھی ہے۔

الحاصل ڈاکٹر صاحب کی تک دو سے یہ معلوم ہوا کہ بغداد میں سیدنا عبد الوہاب جیلانی کے مدفن کا کسی کو صحیح علم نہیں اور ص ۳۶۳ پر صاحب سجادہ کا جو مکتوب نقل کیا گیا ہے اس میں یہ ہے کہ ”بغداد میں سب لوگوں کو معلوم ہے کہ ان کا مدفن ناگور میں ہے۔“ آخر یہ دو سو سال میں اس قدر فرق کیوں ہو گیا؟ بارہویں صدی کے آخر میں جو بات سب کو معلوم تھی وہ چودہویں صدی میں اس طرح نسیا منسیا کیوں ہو گئی کہ اہل خاندان کو بھی خبر نہ رہی۔ وہ بھی کسی اور کے بارے میں نہیں۔ سب سے جید اور مشہور فرزند صلیبی کے بارے میں؟ پھر تیرہویں صدی ۱۲۷۰ھ و ۱۲۷۱ھ میں علامہ فضل رسول بدایونی علیہ الرحمہ نے بغداد کا سفر کیا۔ نقیب الاشراف شیخ علی قدس سرہ کے مہمان رہے، ان کے فرزند سید سلیمان رحمہ اللہ کو ایک عرصے تک درس دیتے رہے مگر وہ بھی نہ جان سکے کہ جس مرکز عقیدت کی زیارت کے لیے وہ بغداد شریف حاضری دیتے ہیں ان کے ایک فرزند صلیبی خود ہندوستان کے شہر ناگور میں مدفون ہیں۔ یعنی صرف ۷۹ سال کے بعد خانوادے میں اسے جاننے بتانے والا کوئی شخص بغداد میں نہ رہا۔ جبکہ سب جانتے تھے۔

(۴) فارسی مکتوب میں جہاں جہاں سیدنا عبد الوہاب کا ذکر کر دو

ترجمہ کے مطابق ہونا چاہیے وہاں بیاض (جلد خالی) ہے۔ صرف ایک جگہ سطر کے اخیر میں نام درج ہے وہ بھی بعد میں لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایک جگہ اوپر حاشیے میں مہر سے ذرا نیچے عبد الوہاب لکھا ہوا ہے۔ درمیان مکتوب اندراج نہیں۔

یو جوہ بالا یہ مکتوب سراسر جعلی معلوم ہوتا ہے۔ ساتھ ہی گمان ہوتا ہے کہ یہ مکتوب ۱۰۹۱ھ میں اپنے مزاج اور تیور کے مطابق مخالفین کو منافقین اور اصحاب الشیاطین کے دل پسند القاب کے ساتھ بنایا گیا تھا۔ ان خالی جگہوں میں سیدنا عبد القادر ثانی یا ان کے فرزند سیدنا عبد الرزاق کا نام حسب موقع تحریر ہوا تھا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ حسب بیان سجادہ نشین خانقاہ بغداد ہم سیدنا عبد القادر ثانی کی اولاد سے ہیں۔ (در اصل یہ خالی جگہیں کچھ ایسی ہی غمازی کر رہی ہیں) بعد میں جب زمانے کی ترقی کے ساتھ ان حضرات نے بھی اپنے دعوے میں ترقی کی اور اپنے یہاں سیدنا عبد الوہاب کا مدفن ہونے کو شہرت دی تو وہی سابقہ مکتوب ذرا سی قطع و برید سے اس مطلب کے لیے بنا کر محفوظ کر لیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۵) بالفرض یہ مکتوب اصلی ہو تو بھی یہ عرض ہے کہ جو بات خود سیدنا عبد الوہاب جیلانی کے معاصرین یا ان کے قریبی دور والے بہ اسناد صحیحہ اپنی متداول کتابوں میں بیان کرتے آئے اس کے خلاف چھ سو سال کے بعد ان کی اولاد میں سے ایک صاحب کا قول راجح نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہو تو کسی بھی عظیم شخصیت کی تاریخ چھ سو سال کے بعد ان کی اولاد میں سے کسی ایک فرد کے قلم سے مسخ ہونے کی راہ نکل آئے گی۔ سارے معتبر علماء، اولیا اور مستند مصنفین کی تحریریں چھ سو سال کے بعد ایک صاحب زادے کی ادنیٰ جنبش قلم سے محض افسانہ بن کر رہ جائیں گی۔ یقیناً اسے کوئی مخلص اور انصاف پسند انسان بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ خصوصاً اگر وہ محقق ہو تو کبھی ایسا راستہ نکالنے کے لیے تیار نہ ہوگا۔

● شجرہ نسب پر بھی کلام کرنا تھا مگر ڈاکٹر صاحب اپنی کتاب میں خود صراحت کر چکے ہیں کہ ”نسب نامے کا وہ حصہ جو سیدنا عبد الوہاب سے ان کے اولاد کو ملتا ہے، اختلافی ہے“ (ص ۳۹۲) اس لیے مزید گفتگو کی ضرورت نہیں ورنہ وہ حصہ بھی محل کلام ہے جو انھیں سیدنا عبد القادر ثانی سے ملتا ہے۔ مولانا تعالیٰ ہدایت نصیب فرمائے اور ہم سب کو صراط مستقیم پر چلائے۔

● بحثیں بہت طویل ہو گئیں اس لیے ماحصل ایک بار پھر ذہنوں میں تازہ کر لیں۔

(۱) سرکار غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تاریخ ولادت میں نقطے شوشے غیر واضح ہونے کی وجہ سے غلط پڑھنے لکھنے کا کوئی احتمال نہیں۔ خود سرکار کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ بغداد میں داخلے کا سنہ ۳۸۸ھ ان کی عمر مبارک اٹھارہ سال تھی۔ اور ثابت ہوا کہ داخلے کا سنہ ۳۸۸ھ ہے۔ اسی سے سال ولادت ۴۰۱ھ کی تعیین کی گئی۔ سال ولادت ۴۹۱ھ ہونے پر کوئی ضعیف سے ضعیف روایت تو کیا کسی قابل ذکر شخصیت کی حکایت بھی نہیں۔

(۲) سال وصال ۵۸۳ھ کسی بھی قابل ذکر کتاب میں موجود نہیں محض ایک غلط مفروضہ ہے۔ جب کہ ۵۶۱ھ روایات کی صحیح سندوں میں مذکور اور دیگر قوی تصریحات سے تائید یافتہ ہے۔ کوئی دانش مند آدمی انھیں رد کرنے کی جسارت ہرگز نہیں کر سکتا۔

(۳) جب خواجہ معین الدین حسن بجزی چشتی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمر پچاس سال تھی اُس وقت غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان کی ملاقات پھر ان کے ساتھ بحکم غوث اعظم ان کے فرزند سیدنا عبد الوہاب جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہندوستان میں آمد پھر ناگور میں سکونت اور تدفین ایسا افسانہ ہے جو بارہویں صدی سے پہلے دنیا کے کسی مصنف کے ذہن میں نہ آیا بلکہ خود ناگور والوں کے ذہن میں بھی نہ آ سکا۔ اس لیے کہ بارہویں صدی سے قبل کی جتنی دستاویزیں اور خانگی کاغذات انھوں نے ثبوت میں پیش کیے کسی میں سیدنا عبد الوہاب جیلانی کا ذکر نہیں۔ بارہویں صدی میں کسی دستاویز میں ذکر آیا ہے تو وہ ”میڑتا“ سے متعلق ہے، جہاں پہلے ان کا چلہ مشہور ہوا، پھر روضہ و مقبرہ کا نام آیا۔ بعد میں یہ دعویٰ ناگور نے اپنے یہاں منتقل کر لیا۔ میڑتا دست بردار ہو گیا۔

(۴) ناگور سے متعلق دستاویزوں میں جب سیدنا عبد الوہاب جیلانی کا کہیں نام و نشان نہیں تو ان کا مدفن ناگور میں ہونے کے ثبوت میں ان دستاویزوں کو پیش کرنا خالص فریب ہے یا زبردست نادانی۔

(۵) یہ دستاویزیں آپسی نزاعات سے متعلق سلاطین و حکام کے فیصلوں پر مشتمل ہیں۔ کسی بھی روضہ و مقبرہ کی تحقیق سے ان کا کوئی لگاؤ نہیں۔ تو اس خصوص میں انھیں پیش کرنا ہی بے جا ہے۔ □□

حکومت کی جانب سے پہلی جنگ آزادی کی ڈیڑھ سوسالہ تقریبات مختصر ہنگامہ آرائی یا تعمیری پہل؟

نوٹ :- ماہنامہ ”جام نور“ اپنے اس کالم میں عصر حاضر کے کسی بھی مسئلہ کے تحت ہندوستان کے نامور علمائے کرام و دانشوران قوم و ملت سے ان کی تحریری رائے لیتا ہے۔ موصول ہونے والی آراء خواہ وہ مثبت یا منفی پہلو پر ہوں، شائع کی جاتی ہیں تاکہ متعلقہ مسئلے کے دونوں پہلو اور باب علم و نظر اور عام قارئین تک پہنچ سکیں اور متعلقہ مسئلہ پر علمائے کرام و دانشوران قوم کی تحقیقی و تجزیاتی رائے کی روشنی میں مسئلے کے صحیح نتائج برآمد ہو سکیں، علماء و دانشوران کی سہولت کے پیش نظر مندرجہ بالا سوال سے متعلق چند ذیلی نکات بھی دیے گئے تھے، تاکہ مندرجہ ذیل خطوط پر دلائل و براہین کے ساتھ وہ اپنا تحقیقی جواب دے سکیں۔ (ادارہ)

نکات

- {1} کیا اس طرح کی تقریبات سودمند ہیں؟ یا مختصر پیسے کا زیاں ہے؟
- {2} کیا اب تک لکھی گئی تاریخیں مسلمانوں بالخصوص علماء کی قربانیوں کے ساتھ انصاف کرتی ہیں؟
- {3} کیا ۱۸۵۷ء کی تاریخ کو دوبارہ لکھنے کی ضرورت ہے؟
- {4} اس سمت میں کیا کیا تعمیری کام ہو سکتے ہیں؟
- {5} حکومت سے محاسبہ اور مواخذے کے کیا طریقے اپنانے چاہیے؟

”اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس طرح کی تقریبات میں اکثر پیسوں کا زیاں ہوتا ہے، کیونکہ حکومت ایسی تقریبات کا اعلان کرتے وقت اس کے لیے ماہرین سے لائحہ عمل مرتب نہیں کرتی“

ڈاکٹر خواجہ اکرام

(۱) **حکومت ہند** نے ۱۰ مئی ۲۰۰۷ء سے سال رواں کے مئی تک پہلی جنگ آزادی کی ڈیڑھ سوسالہ تقریبات منانے کا فیصلہ کیا، اسی کے ساتھ ساتھ ۱۵ اگست ۲۰۰۷ء سے اگست ۲۰۰۸ء تک آزادی کی ساٹھ سالہ تقریبات کا بھی اعلان کیا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ حکومت ہند نے ۱۸۵۷ء کی جنگ کو پہلی جنگ آزادی سے موسوم کیا، ورنہ اب تک خود اس ملک کے تاریخ نویسوں نے بھی اسے کبھی غدار اور کبھی انقلاب کا نعروں دیا۔ حکومت کی جانب سے اس پہل کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے، کیونکہ ۱۸۵۷ء کی جنگ کو کبھی صحیح پس منظر میں سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ حکومتی سطح پر اس اعلان کے بعد پورے ملک میں ایک جوش و خروش دیکھا گیا اور اس ہندوستان کی تاریخ کی اس کڑی کونے سرے سے سمجھنے کی کوشش بھی کی گئی۔ حکومت کی جانب سے جو بڑے پروگرام ہوئے وہ مختصر بڑے شہروں تک محدود رہے ان میں ایک بڑا پروگرام نہرو یو اے کیندرا کے زیر اہتمام ہوا، جس کے تحت ۱۰ مئی کی یاد تازہ کرنے اور نئی نسل کو اس آزادی سے روشناس کرانے کے لیے عوامی سطح پر ایک بڑی ریڈیو نکالی گئی جس میں ملک کے مختلف حصوں سے نہرو یو اے کیندرا کے ممبران شریک ہوئے، جو میرٹھ سے چل کر دہلی کے لعل قلعہ پر ختم ہوئی، اسی رات کو رنگارنگ پروگرام بھی ہوا جس میں سینکڑوں روپے کے وارے نیارے ہوئے۔ اس کے علاوہ بھی حکومت کی جانب سے ایک بڑا اہتمام یہ ہوا کہ آزادی کی ریل چلائی گئی۔ اس ٹرین میں ۱۸۵۷ء سے متعلق تمام نادر تصاویر اور دیگر یادگار اشیاء کو رکھا گیا اور یہ ٹرین ملک کے مختلف حصوں سے ہو کر گزری، لیکن یہ ٹرین بھی مخصوص علاقوں تک ہی محدود رہی اور شاید اسے دیکھنے کے لیے بھی اسی جگہ کے لوگ جمع ہوئے جو بڑے ریلوے اسٹیشن کے قریب رہتے ہیں۔ میں نے ذاتی طور پر کچھ ایسے لوگوں سے اس ٹرین سے

متعلق پوچھا جو دروازوں میں رہتے ہیں تو انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے بھی عوام کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا، اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس طرح کی تقریبات میں اکثر پیسوں کا زیاں ہوتا ہے، کیونکہ حکومت اس تقریبات کا اعلان تو کر دیتی ہے لیکن لائحہ عمل مرتب کرنے کے لیے ماہرین سے مدد نہیں لیتی اسی لیے اس طرح کے اعلانات اور تقریبات کا یہ حشر ہوتا ہے۔

(۲) بالکل انصاف نہیں کرتیں اور خاص کر علماء اور مسلمانوں کے ساتھ تو صریحاً نا انصافی کرتی ہیں۔

(۳) بلاشبہ ۱۸۵۷ء کی تاریخ کو نئے سرے سے لکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ المیہ یہ ہے کہ جس طرح ہماری ہندوستانی تہذیب پر حملے ہو رہے ہیں اسی طرح ہماری تاریخ پر بھی کاری ضرب لگائی جا رہی ہے۔ لیکن کم اہل نظر ہیں جو اس حوالے سے اپنے رد عمل کا اظہار کر رہے ہیں۔ ہندوستانی تاریخ کو جس طرح سے غیر ملکیوں نے تباہ کیا ہے اس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی، جن انگریزوں نے اس ملک کو لوٹا دیا ہی اس کی تاریخ بھی لکھ رہے تھے اور آج کے فیشن پرست معاشرے میں انھیں کی کتابوں کو سب سے معتبر سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے اس ملک کی تہذیب اور تمدنی تاریخ بڑھ کر ہمیشہ لکھنے کا احساس ہوا۔ کیونکہ ہندوستان میں انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی اس لیے سب سے زیادہ خطرہ انھیں مسلمانوں سے ہی تھا، چنانچہ انھوں نے ایک طرف سب سے زیادہ مظالم بھی مسلمانوں پر ہی ڈھایا اور شعوری طور پر ان کی تاریخ کو بھی مسخ کرنے کی کوشش کی، پھر اس کے بعد عہد جدید کے تاریخ نویس بھی علمی دیانت داری سے کام نہیں کر سکے کیونکہ اس عہد کی زبان اردو اور فارسی تھی، لہذا تمام بنیادی مواد اسی زبان میں موجود تھے اور یہ تاریخ نویس ان سے ناواقف بھی تھے اور واقف ہونا بھی نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے رفتہ رفتہ جدید ہندوستان کی تاریخ سے مسلمانوں کا نام و نشان گم ہوتا گیا اور اب نوبت یہ ہے کہ جب بھی حکومت جنگ آزادی کی بات کرتی ہے یا جب کوئی ایسی تقریب منائی جاتی جس میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ جنگ آزادی کے ہیروز کی تصویریں شائع کی جاتی ہیں تو ان میں کوئی چہرہ مسلمان کا نہیں ہوتا۔ ہاں اگر کوئی چہرہ نظر آتا ہے تو اس میں صرف مولانا ابوالکلام آزاد کا چہرہ ہوتا ہے جیسے صرف مولانا آزاد نے ہی جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور کوئی نہیں۔ حالانکہ سچائی بالکل اس کے برعکس ہے، ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک اور ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء کی تاریخی سچائیوں کو کھگانے کی کوشش کریں تو معلوم ہوگا کہ اس طویل اور تاریخی جنگ میں جس طرح علمائے کرام نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اس طرح کسی اور مذہب کی شخصیات نے وہ کردار ادا نہیں کیا۔ ایک طویل فہرست ہے جس کے لیے کئی دفاتر کی ضرورت ہے، لیکن جس طرح دوسروں نے ہماری قربانیوں اور وطن پر جاں نثاریوں کو بھلا دیا اس سے زیادہ ہم نے بھی غفلت کا ثبوت دیا ہے۔ ایک اور پہلو پر بھی غور کریں کہ تاریخ نویس اتمام حجت کے لیے اگر علماء کا نام لیتے بھی ہیں تو وہ دہائی تحریک سے شروع کرتے ہیں اور وہیں ختم بھی کر دیتے ہیں۔ جو تاریخ کے ساتھ سراسر نا انصافی ہے۔

(۴) اس سمت میں پہلا تعمیری کام یہی ہو سکتا ہے کہ تاریخ کو اصل تناظر میں اور بغیر کسی تعصب کے بنیادی مواد کے سہارے مرتب کیا جائے اور بنیادی مواد عربی، فارسی اور اردو میں موجود ہیں۔ دوسرا کام یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے حوالے سے ایک انسائیکلو پیڈیا تیار کیا جائے جس میں تمام تفصیلات موجود ہوں اور اسے حکومت کے ویب سائٹ پر ڈالا جائے تاکہ تمام دنیا کے لوگ اسے دیکھ سکیں۔ تیسرا کام یہ ہو سکتا ہے کہ لعل قلعہ کے سامنے ایک دیوار آزادی بنائی جائے جس میں تمام شہیدوں کے نام لکھے ہوں۔ اسی طرح یہ کام بھی ہو سکتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے رسالے ۱۸۵۷ء سے متعلق ماہرین سے لکھوا کر ہندوستان کی تمام زبانوں میں شائع کیا جائے۔ اور اسے ملک کے تمام اسکولوں اور مدرسوں میں مفت بھیجا جائے تاکہ نئی نسل اس تاریخ سے آشنا ہو سکے۔

(۵) حکومت سے اس سلسلے میں مواخذے کی سخت ضرورت ہے کیونکہ اس حوالے سے حکومت نے کروڑوں روپے مختص کیے۔ مگر ایک دوا، ہم کام جیسے بھگت سنگھ، حیدر، بہادر شاہ ظفر، حیدر کے علاوہ چھوٹے موٹے کام ہوئے ہیں۔ ابھی تک اس تاریخ اور اصل دارشین جو کہ علمائے کرام ہیں ان کی خدمات نہ لینے کی ضرورت محسوس کی گئی اور نہ حکومت انھیں لائق اعتنا سمجھتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ حکومت سے پوچھا جائے کہ جو تاریخ عربی، فارسی اور اردو زبان میں دستاویز کی شکل میں مختلف لائبریریوں میں موجود ہے ان کو کب تک آرکائیو کی زینت بنایا جائے گا۔ سب سے پہلے حکومت کو اس سلسلے میں کام کرنا چاہیے تھا لیکن ابھی تک میرے علم کے مطابق کچھ نہیں ہو سکا ہے۔ اس لیے رائٹ آف انفارمیشن کے تحت مختلف

لوگوں کی جانب سے مسلسل اور متواتر سوالات پوچھے جانے چاہیں، شاید یہ تیر نشانے پر لگے۔ قارئین کو بتانا چاہوں گا کہ ابھی عوام کے پاس اس سے بڑھ کر کوئی مضبوط اسلحہ نہیں ہے، لہذا اسے استعمال کیا جانا چاہیے۔ □□□

۱۸۵۷ء کی تاریخ کو دوبارہ لکھنے اور اس پر نظر ثانی کرنے کی بات تو تب ہوتی جب اس موضوع کے تمام پہلوؤں پر لکھا جا چکا ہوتا، ابھی تو تاریخ کے اس اہم واقعہ کے بنیادی مآخذ ہی تلاش نہیں کیا جاسکے ہیں ۴۹

☆ ڈاکٹر عظمیٰ اخلاق ☆

ہندوستان کی جدید تاریخ اور موجودہ عالمی منظر نامہ کے پیش نظر ۱۸۵۷ء کی ایک سو پچاس ویں سالگرہ ایک ایسا تاریخی موقع ہے، جب اس کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی جاسکتی ہے۔ یہ قومی سطح پر ہماری تاریخی اور سیاسی ضرورت بھی ہے، کیوں کہ جو حالات اس انقلاب کی ناکامی کی صورت میں پیدا ہوئے، وہ اتنے وحشت ناک اور بھیانک تھے کہ آئندہ دو نسلیں اس کے متعلق کھل کر گفتگو کرنے کی جرأت نہ کر پائی اور اس کے ذراؤں نے نقش ہندوستان کی آزادی تک قائم رہے اور آزادی ایسے حالات میں نصیب ہوئی جب جنگ آزادی کے عظیم اصول و ضوابط پس پشت ڈال کر تقریباً پورا برصغیر سامراجیوں کی ناپاک اور اتحاد شکن پالیسیوں اور عزائم کا شکار ہو گیا۔

چنانچہ ۱۹۵۷ء میں اس انقلاب کے سو سالہ سالگرہ کے موقع پر کچھ خاص توجہ نہ ہو پائی۔ جب کہ ضرورت اس بات کی تھی کہ اس کے بعد اس انقلاب کے منبے نقوش کو یکجا کیا جاتا اور اسے آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کر لیا جاتا۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اس انقلاب کے عظیم رہنماؤں کو پوری طرح فراموش کیا جا چکا ہے۔ یہاں تک کہ بہادر شاہ ظفر کی آخری خواہش کو علالتی طور پر پورا کرنے میں بھی نہ صرف آج کی حکومت قاصر نظر آتی ہے، بلکہ عوامی سطح پر بھی عام بے اعتنائی اور بے حس پائی جاتی ہے۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ نہ صرف اس سالگرہ کو بڑے پیمانے پر منائیں بلکہ اسے ملک کے تمام اسکولوں کے ایک ایک بچے تک پہنچائیں اور انہیں اپنے اسلاف اور ان کی عظیم قربانیوں اور وراثت سے روشناس کرائیں اور یہ بھی بتائیں کہ سامراج کیا ہوتا ہے، کیا کرتا ہے اور آج بھی کتنا بڑا خطرہ ہے؟

خاص طور سے مسلمان دانشوروں اور علماء کو اس طرف خصوصی توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اس ملک کی سیاست نے فضا کو اس قدر مسموم کر دیا کہ مسلمان نام شہر ممنوعہ بن کر رہ گیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں، جہاں پورا ملک مختلف بنیادوں پر جذباتی طور پر صدیوں سے بننا ہوا ہے، وہاں لوگ تحقیق اور تاریخ نویسی کے وقت بھی شجرہ دیکھنا نہیں بھولتے اور عموماً ان باتوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اس پر انگریز مورخین نے ستم بالائے ستم یہ ڈھایا کہ اس تقسیم کو اور عوامی اور اس ملک کے حکمرانوں، حتیٰ کہ زبانوں کو بھی مذہبی بنیادوں پر تقسیم کر دیا۔ ایسی صورتحال میں صرف دوسروں کی شکایت کرنے کے بجائے خود مسلمان محققین، مصنفین، علماء اور دانشور حضرات کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اس جنگ اور اس انقلاب کے مختلف گوشوں پر کام کریں اور آپسی اختلافات اور مسلکی بنیادوں پر اسلاف کو بانٹنے اور کچھڑا اچھال کر وقت ضائع کرنے کے بجائے، اسے پورے طور پر سامنے لائیں اور تمام مسلمانوں کے ساتھ ساتھ اہل وطن کو یہ بتائیں کہ ہمارے اسلاف نے زمین و وطن کے ایک ایک ذرہ کو کس طرح اپنے خون سے سینچا ہے۔

۱۸۵۷ء کی تاریخ کو دوبارہ لکھنے اور اس پر نظر ثانی کی بات تو تب ہوتی، جب اس موضوع کے تمام پہلوؤں پر لکھا جا چکا ہوتا۔ ابھی تو بنیادی مسئلہ یہی ہے کہ تاریخ کے اس اہم واقعہ کے بنیادی منابع کی پوری طرح جمع آوری ہی نہیں ہو سکی ہے۔ ابھی تک مورخین حضرات اس کے سب اہم منابع، جو بلاشبہ فارسی اور اردو میں ہیں، اسی سے پوری طرح واقف نہیں ہیں اور ان میں زیادہ تر کی تاریخ نویسی کی بساط انگریزوں کی لکھی ہوئی انگریزی کی کتابوں کے ارد گرد ہی گھومتی نظر آتی ہے۔ اس لیے اس ۱۵۰ ویں سالگرہ پر حکومت، عوام اور دانشور حضرات مجموعی طور پر اسی کام کو انجام دے لیں تو یہ بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔

اس سمت میں سب سے اہم کام، جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ہندوستانی تاریخ کے اس اہم واقعہ کے گواہ فارسی اور اردو کے بنیادی منابع کی

جمع آوری اور اشاعت اور اس کی بنیاد پر واقعات کی مختلف کڑیوں کو جوڑنے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی میڈیا اور مختلف دوسرے پروگراموں کے ذریعہ عام لوگوں کو اس سے روشناس کرانے اور بیداری پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی نہایت اہم یہ ہے کہ اسکول، مدارس کی کتابوں میں ۱۸۵۷ء کی تاریخ اور اس جنگ آزادی کے جہالوں سے متعلق ابواب کی شمولیت کے ساتھ کويز وغیرہ جیسے پروگرام کے ذریعہ بچوں کو اپنی تاریخی وراثت اور اس کی ضرورت کو بتانے اور سمجھانے کی بھی ضرورت ہے۔

عام طور سے دیکھنے میں یہی آتا ہے کہ جس کام سے سیاسی پارٹیوں کو ووٹ ملنے کی امید ہوتی ہے، اسی کی طرف ان کی توجہ بھی ہوتی ہے اور اس دوڑ میں یہ پارٹیاں کسی حد تک جانے کو تیار نظر آتی ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں جو بیدار لوگ ہیں، وہ اپنے مفاد کی جنگ اپنی تعداد کا احساس دلا کر جیتنے رہے ہیں۔ یہ موقع اس احساس کا بھی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی تیزی اور ان کے ساتھ متعصبانہ رویہ کی جوابدہا ہوئی ہے، اس کے اسباب غلغلہ کو درک کریں اور اس کی شروعات تعلیم سے ہونی چاہئے۔ اسی سے بیداری آئے گی۔ لوگ تہیہ کریں اور اپنے علاقوں کے لیے بہتر اسکول اور تعلیمی سہولیات کی مانگ کریں اور اس کے حصول کے لیے اپنے اس جمہوری ہتھیار کا استعمال کریں۔ یہ مجموعی ضرورت ہے، اس لیے مجموعی کوشش کریں اور ۱۸۵۷ء کے اتحاد سے سبق لیں۔ اسی سے ملک کی ترقی بھی ممکن ہے اور مسلمانوں کی بھی۔ ساتھ ہی یہ بھی سوال ہونا چاہیے کہ اس انقلاب میں شامل جہالوں کی یادگار کے لیے حکومت نے کیا کیا ہے، اور کیا کر رہی ہے۔ اس تاریخ کے شواہد کی حفاظت کے لیے کیا کیا گیا ہے۔ ان کے خانوادہ کے افراد جو دردر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں، ان کے لیے حکومت نے کیا اقدام اٹھائے ہیں اور نہیں، تو کیوں نہیں۔ آج اس جنگ عظیم کے شہداء گھرانے سندھیا، پٹیل والے اور اسی قبیل کے لوگ اس ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بنے ہوئے ہیں، لیکن اپنی جان کی قربانی دینے والوں کے وارثین ذلت اور فلاکت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں، تو ایسا کیوں ہے؟ □□□

”۱۸۵۷ء کی ڈیڑھ سو سالہ تقریبات کے لیے حکومت کے ذریعے مہیا کرایا گیا فنڈ ایک تعمیری پہل ہے، اس کے ذریعے ۱۸۵۷ء کی یاد جو کہ ہماری پہلی جنگ آزادی کا درجہ رکھتی ہے، ملک کے تمام حصوں میں پہنچائی جاسکے گی“

☆ مہر فاطمہ حسین ☆

(۱) کسی بھی ملک کی تاریخ اس کی شناخت ہوتی ہے، تاریخ نویسی کے لیے تجزیہ و تحقیق ایک لازمی عنصر کا درجہ رکھتی ہے، اسی مقصد کے پیش نظر حکومت کسی بھی اہم تاریخی واقعات کے اہتمام کے لیے فنڈ مہیا کراتی ہے۔ ان تقریبات کا بنیادی مقصد اس واقعہ اور تاریخی گوشے کو متعارف کرانا ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس واقعے سے متعلق جو عظیم مثالیں ہیں اس کو عام لوگوں تک پہنچانا بھی مقصود ہوتا ہے۔ اور نوجوانوں کو اس سے متعارف کرانا ہوتا ہے تاکہ وہ اس واقعے سے متاثر ہوں اور عمل میں لائیں، اگر ہم ان واقعات کے حوالے سے تقریبات نہ کریں تو ہماری تاریخ اندھیرے میں گم ہو سکتی ہے۔ اگر ہماری تاریخ غیر ملکی لکھیں گے تو تاریخ کے نسخہ ہونے کا خدشہ رہتا ہے، جیسا کہ ہم جانتے ہیں حکومت نے پہلے بھی اس طرح کی تقریبات کے لیے کافی فنڈ مہیا کرایا تھا مثلاً آزادی کی پچاس سالہ تقریبات، جو اعلیٰ نہرو اور لال بہادر شاستری کی پیدائش کی صد سالہ تقریبات وغیرہ۔ ان تقریبات کے ذریعے کافی اہم تعمیری کام ہوئے ہیں۔ اسی طرز پر ۱۸۵۷ء کی ڈیڑھ سو سالہ تقریبات کے لیے حکومت کے ذریعے مہیا کرایا گیا فنڈ ایک تعمیری پہل ثابت ہوگی۔ اس پہل کے ذریعے ۱۸۵۷ء کی یاد جو کہ ہماری پہلی جنگ آزادی کا درجہ رکھتی ہے، ملک کے تمام حصوں میں پہنچانے میں کارگر ہوگی۔

(۲) ہندوستان کی قومی اور تہذیبی تاریخ میں مسلمانوں کا اہم حصہ رہا ہے مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے خدمات کو تاریخ میں کمتر آٹکا گیا ہے۔ ۱۸۵۷ء سے متعلق مواد کو از سر نو ترتیب دے کر مسلمانوں کی حصہ داری کو عوام تک پہنچا سکتے ہیں۔ اب تک مولے طور پر یہ سمجھا جا رہا ہے کہ بہادر شاہ ظفر نے ۱۸۵۷ء کی جنگ میں ایک نارضامند بادشاہ کے حیثیت سے شرکت کی وہ بھی ہندوستانی سپاہیوں کے دباؤ میں آکر، جبکہ موجودہ تحقیق اور تفتیش کے بعد اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں بہادر شاہ ظفر کی ذمہ دارانہ شمولیت تھی۔ اس صف میں مولوی

محمد باقر (مدیر دہلی اردو اخبار) مولانا فضل حق خیر آبادی اور کئی نیشنلسٹ علماء کی قربانیوں کا ذکر کر سکتے ہیں۔ جواب تک unexplored ہیں۔ اس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ پہلی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا اہم حصہ رہا ہے جنہوں نے ملک کے دیگر اقوام و ملل کے ساتھ مل کر ہندوستان کی تاریخ کو ایک سیکولر رنگ دیا ہے۔

(۳) جی ہاں 1857 کی تاریخ دوبارہ لکھنے کی ضرورت ہے۔ 1857 ایک ایسا موقع ہے جس نے ہماری جنگ آزادی کی پہلی کی۔ بیشتر تاریخ نویس اس جنگ کو یا تو علاقائی بغاوت، سپاہی بغاوت یا جہاد کا نام دیتے ہیں۔ ٹھیک اس وقت جب ہندوستان 1857 کی تقریبات منا رہا ہے ولیم ڈارویل نے اپنی کتاب *The Last Mughal* میں اسے 'جہاد' سے تعبیر کیا ہے۔ اس طرح کے متعصب نظریات سے 1857 کی اہمیت پر حرف آتا ہے اور اس کی عظمت محدود ہو جاتی ہے۔ سچائی تو یہ ہے کہ 1857 کی جنگ کا مقصد ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانا، استحصال کو ختم کرنا اور ہندوستان کی عظمت رفتہ کو واپس دلانا تھا۔ آج بھی 1857 سے متعلق بہت سی صداقتیں اور مواد و منابع ایسے ہیں جو اس بات کی گواہی دینے کی قوت رکھتی ہیں۔ دوبارہ تاریخ نویسی سے یہ بات ثابت ہوگی جس کی کڑی ہم ہندوستان کی 1947 کی آزادی سے جوڑ پائیں گے۔ اس طرح سے ہم 1857 کے جوشہدا ہیں ان کی قربانیوں کو خراج عقیدت پیش کر سکیں گے۔

(۴) 1857 سے متعلق بہت ساری صداقتیں اور حقائق ہیں جواب تک عوام تک نہیں پہنچی ہیں۔ اس لیے پہلی ضرورت تو یہ ہے کہ 1857 سے متعلق جو مواد ملک اور بیرون ملک میں موجود ہیں انہیں جمع کیا جائے، ساتھ ہی اسکے تجزیے اور تشخیص کی بھی ضرورت ہے۔ اس جنگ سے منسوب جو *Sung and unsung Heroes*، مذہبی شخصیات، دانشور اور خواتین ہیں ان کی گرانقدر قربانیوں کا اعتراف بھی ضروری ہے جنہیں تاریخ نے نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انگریزی منابع کے علاوہ *Native sources*، اردو، عربی اور فارسی کے جو منابع ہیں ان کی بنیاد پر اپنی ملکی تاریخ لکھنا، 1857 سے متعلق جو اطلاعات ہیں ان کو عوام تک پہنچانا، اس کے لیے کتابیں، میگزین، جرنل اور انسائیکلو پیڈیا شائع کرنا، ڈکیومنٹری، سیریل اور ٹیلی فلم تیار کرنا، 1857 سے متعلق لائبریری، میوزیم، یونیورسٹیز میں چیرس قائم کرنا اور 1857 سے تعلق رکھنے والی عمارتوں اور جگہوں کی حفاظت اور ان کی تجدید کرنا، 1857 سے متعلق شخصیات کے نام پر ایوارڈ شروع کرنا، سیمینار، کانفرنس اور ورکشاپ کرنا وغیرہ تعمیری کام ہو سکتے ہیں۔

(۵) سب سے پہلے حکومت نے مسلمانوں کے لیے جو اسکیم اور منصوبے بنائے ہیں ان سے واقفیت ہونی چاہیے اور حکومت سے گزارش کرنی چاہیے کہ ان کو ایماندارانہ طریقے سے عملی جامہ پہنائیں ایسا نہ ہو کہ ساری پلاننگ صرف کاغذ پر ہی رہ جائے۔

(الف) مسلمانوں کے مسائل سے حکومت کو آگاہ کرنا چاہیے۔ (ب) آئینی اور قانونی طریقے سے اپنے حقوق کے لیے احتجاج کرنا چاہیے۔ (ج) ان مسائل پر رائے عامہ ہموار کرنی چاہیے جس میں ملک کے علماء اور دانشوروں کی نمائندگی ہو۔ (د) جیسا کہ جسٹس سچرن نے اپنی رپورٹ میں بیان کیا کہ مسلمانوں کے حالات ملک کے دلت معاشرہ سے بہتر نہیں ہیں، لہذا مندرجہ ذیل نکات پر فوری دھیان دلوانا چاہیے۔

۱۔ حکومت ایسے اقدامات کرے جس سے مسلمان بچے تعلیم حاصل کر سکیں۔

۲۔ مدرسوں میں جدید نصاب کے لیے فنڈ مہیا کرایا جائے۔

۳۔ اردو کی ترقی کے لیے اقدامات کیے جائیں۔

۴۔ مسلمانوں کو کم انٹرسٹ پر لون مہیا کرایا جائے۔ تاکہ ایک بڑی مسلم آبادی خود کفیل ہو سکے۔

۵۔ فرقہ وارانہ فسادات کے انسداد کی کوشش کی جائے۔

۶۔ مسلمانوں کے خلاف غلط پروپیگنڈے کو روکا جائے۔

۷۔ حکومت مسلمانوں کے لیے کالج اور یونیورسٹیز میں داخلے اور سرکاری و غیر سرکاری ملازمتوں میں ریزرویشن دے تاکہ مسلمانوں کے

اقتصادی حالات بہتر ہو سکیں۔ □□□

اظہار خیالات

اس کالم میں آپ سیاسی، سماجی، ادبی، مذہبی اور ملی کسی بھی مسئلہ پر اپنی فکر اور اپنے خیال کا برملا اظہار اور بے لاگ تبصرہ کر سکتے ہیں جو ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع کیا جائے گا، واضح ہو کہ اس سلسلے میں آپ کی تحریر مختصر اور جامع ہونی چاہیے..... (ادارہ)

یزید کو رضی اللہ عنہ کہنا ناجائز و حرام ہے

محمد طاہر حسین مصباحی

تر بیت افتا مرکز اداریہ شریعہ، سلطان گنج، پٹنہ (بہار)

مکرمی ایڈیٹر صاحب قبلہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ..... مارچ کا جام نور باصرہ نواز ہوا پڑھ کر طبیعت خوش اور دل باغ باغ ہو گیا۔ تمام مضامین اچھے اور لائق مطالعہ ہیں خاص کر مولانا انوار احمد بغدادی کا مضمون ”ڈاکٹر ذاکر نانک کا ریمارک“ بروقت لوگوں کے فکری انتشار کے جراثیم کو ختم کرنے کے لیے تریاق ثابت ہوگا، دراصل مولانا کا یہ مضمون ڈاکٹر ذاکر نانک کے اس بیان کا رد ہے جو انہوں نے سائنس سمیہ میدان میں منعقدہ امن کانفرنس میں سوال و جواب کے دوران یزید کو ”رضی اللہ عنہ“ کہا اور معرکہ کربلا کو سیاسی جنگ قرار دیا۔ بغدادی صاحب نے قرآن و احادیث، اقوال فقہاء اور تاریخ کے حوالے سے یزید کے بھیا تک جراثیم اور گھنونا کردار کو صفحہ قرطاس پہ ظاہر و باہر کر دیا، مگر یزید کو رضی اللہ عنہ کہنے یا نہ کہنے کا فیصلہ خود قارئین پر چھوڑ دیا، مولانا بغدادی کا مضمون خوب سے خوب تر ہے اللہ تعالیٰ ان کی عرق ریزی کا اجر عطا فرمائے۔

ناچیز بھی اس حوالے سے چند سطور حاضر کرنے کی جرات اس لیے کر رہا ہے کہ مجھ سے چند لوگوں نے یہ سوال کیا کہ یزید کو ”رضی اللہ عنہ“ نہ کہیں تو پھر کیا کافر کہیں گے؟ جب میں نے محسوس کیا کہ یہ مسئلہ لوگوں کے درمیان نزاعی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے تو اپنی ذمہ داری سمجھا کہ اقوال فقہاء کی روشنی میں اس مسئلہ کو واضح کیا جائے یزید کی لعن و تکفیر کے بارے میں فقہائے کرام کے درج ذیل اقوال ہیں:

(۱) امام اعظم رضی اللہ عنہ اور ان کے متبعین سکوت کے قائل ہیں کہ اس سے فسق و فجور متواتر ہیں کفر متواتر نہیں مگر اس کے فسق و فجور سے انکار کرنا مردود اور اہل سنت کا عذر و عنود ہے (فتاویٰ رضویہ ج: ۶، ص: ۱۰۷)

(۲) امام غزالی اور ان کے متبعین کا موقف یہ ہے کہ اس پر لعنت نہ کی جائے، نیز اس ص: ۳۳۱ پر ہے ”وانکسر ذلک بعض العلماء و

منہم الامام الغزالی“

(۳) حضرت امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ اور ان کے متبعین کے نزدیک بلا تردید تکفیر جائز ہے، نیز اس ص: ۳۳۱ پر ہے ”بعضہم اطلق اللعن علیہ منہم ابن الجوزی المحدث و صنف کتابا سماہ الرد علی المتعصب العنید المانع عن ذم یزید و منہم الامام احمد بن حنبل“ یہ تینوں فریق اہل سنت و جماعت سے ہیں، کوئی بھی سنی مسلمان ان تینوں مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کو اختیار کرتا ہے تو اس سے اس کی سنیت میں کوئی فرق نہیں آتا وہ بدستور سنی المذہب رہے گا۔ لیکن حنفی مقلد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کو اپناتے ہوئے سکوت اختیار کرے۔

مولانا بغدادی صاحب کے مضمون سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ یزید باجماع اہل سنت فاسق و فاجر اور جری علی الکبائر تھا۔ حریم طہیمین، کعبہ معظمہ اور روضہ طہیمہ کی سخت بے حرمتی کی، مسجد نبویؐ میں گھوڑوں کو باندھا، ان کی لید اور پیشاب منبر اطہر پر پڑے۔ تین دن تک مسجد نبویؐ بے اذان و نماز کے رہی، مکہ و مدینہ میں بہت سے صحابہ تابعین بے گناہ شہید کیے گئے۔ جب کہ ایک مومن کا عداقت کفر کی حد تک آدمی کو پہنچا دیتا ہے ”و من یقتل مومنا متعمدا فقد کفر“

اتنے بھیانک اور سنگین جرائم کے مرتکب ہونے کی وجہ سے یزید کا فاسق و فاجر ہونے پر کوئی شک نہ رہا اور فاسق و فاجر شخص کو ”رضی اللہ عنہ“ کہنا ناجائز و حرام ہے، اس لیے یزید کے نام کے ساتھ ”رضی اللہ عنہ“ لگانا ناجائز و حرام ہوگا۔

مولانا وحید الدین خان کی سو فسطائیت

محمد متوسم (انجینیئر)

۳۳ جی ٹی روڈ، چامپدانی، ہوگلی (بنگلہ)

محترم خوشتر نورانی صاحب! السلام علیکم..... فروری کا شمارہ تاخیر سے ملا۔ حسب توقع ادارہ ”زوال کا ادراک“ معیاری اور نتیجہ خیز ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا اور علامہ اقبال میں دو صفات مشترک نظر آتی ہیں۔ Scholarly Exactitude اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ زوال امہ کا سبب علامہ نے صرف احساس زیاں کے جانے کو نہیں ٹھہرایا بلکہ امہ سے روح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نکالے جانے کو بھی شمار کیا ہے۔ آج جن مسلمانوں نے محبت و آداب رسالت کا پاس رکھا وہ بھی زوال پذیر ہیں۔ کیونکہ انہوں نے آداب و محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حرز جاں تو بنایا مگر اختیار شعار مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے تسابلی برتی۔ لہذا وہ دولت ایمانی سے تو سرشار ہیں مگر دولت جہاں گیری سے محروم۔ جس کا اظہار علامہ نے یوں کیا ہے۔

تاشعار مصطفیٰ از دست رفت قوم راز مرز بقا از دست رفت

اب تو شعار (Model?) مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ”غیر کاملہ“ (Incomplete) ثابت کر کے اپنی علمیت کا رعب جھاڑا جا رہا ہے۔ سچ کی آمد ثانی کے Pretext میں اسوہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کاملیت سے انکار کے رد میں آپ کا مدلل ادارہ (نومبر) Decisive اور Conclusive ہے۔ پھر بھی امید تھی کہ وہابی مکتب فکر کا ”الرسالہ“ آپ کے ادارہ کے بعد اپنے موقف کو (جو آپ کے ادارہ کے بعد بالکل کمزور پڑ گیا ہے) اب Sophistry کے بجائے درست Argument سے مضبوط کرے گا۔ نومبر اور جنوری انتظار میں گزرا۔ اب فروری کا الرسالہ پیش نظر ہے۔ مگر اس میں بھی اسوہ رسول کے غیر کامل ہونے پر کوئی علمی دلائل و گفتگو کے بجائے الرسالہ کے ناقدین کو مخالفین کہہ کر صفحہ ۸ کے وسط پیرا گراف میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ شاید جام نور سے متعلق نہیں یا پھر آپ کے ادارہ کو پڑھے بغیر یہ سطریں لکھ ڈالی گئی ہیں۔ فروری کے شمارے سے ظاہر ہے کہ مولانا ”نہ جائے رفیق نہ پائے ماندن“ کے مقام سے دو چار ہیں۔

یہ ایک فطری اصول ہے کہ عدم نص دلیل نفی نہیں۔ اسوہ رسول کی کاملیت کا انکار کرنے کے لیے اس طرح کا صریح نص ہونا چاہیے تھا: ”اسوہ رسول غیر کاملہ ہے“۔ چونکہ اس طرح کا نص موجود نہیں۔ لہذا اسوہ رسول کی کاملیت کا انکار سر دلبر اس ہے، طبیعت ہے، شریعت نہیں۔ اللہ عز وجل کا اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بڑا فضل ہے کہ اس نے آپ کے اسوہ کو حسنہ کہا ہے کاملہ نہیں۔ ورنہ بے لگام فکر یہ کہتا کہ ”رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اسوہ کاملہ ہے مگر حسنہ نہیں“۔ واضح رہے کہ حسنہ میں کاملہ Inclusive ہے۔ کوئی شے اسی وقت حسنہ کہلاتی ہے جبکہ وہ کامل ہو۔ یہ بات قابل حیرت ہے کہ ایک Model کسی خاص زمانہ میں Obsolete اور Less applicable ہو اور اس کے مد مقابل ایک ”زیادہ قابل انطباق“ ماڈل موجود ہو پھر بھی قرآن اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی حسنہ کہے۔ مولانا وحید الدین کے Utopia میں ان کا More applicable (hypothetical) model اور اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں انتخاب کے وقت قرآن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ماڈل کو ہی حسنہ کہے گا۔ منہاج سے متعلق مولانا کے Sophistry کو آپ نے نومبر کے شمارے میں بالکل عیاں کر دیا ہے۔ پھر بھی Prejudiced قلب و نظر اعتراف حقیقت سے محروم ہے۔ اس کی مثال مولانا کے ایک معتقد کا وہ غلو آمیز خط ہے جو اسی شمارہ میں شائع ہے۔ وہ مولانا کے Sophism سے مرعوب ہیں۔ آپ کے ادارہ (نومبر) پر یہ بھی مولانا کی طرح کوئی علمی گفتگو پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ انہوں نے بھی مولانا کی طرح موضوع سے ہٹ کر جام نور (مخالفین) سے متعلق غیر اہم باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔

مولانا کے دفاع میں یہ دلچسپ بات کہی ہے: ”سیرت رسول کے موضوع پر مطبوعات الرسالہ کے تحت ایک درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ایسی حالت میں علمی طریقہ صرف یہ ہوگا کہ ان مطوعہ کتابوں کو سامنے رکھ کر اس معاملے میں کوئی رائے قائم کی جائے، نہ کہ صرف ایک

بات کو لے کر اس کے خلاف سطحی قسم کی بے معنی دھوم مچائی جائے۔“ (صفحہ: ۳۶، الرسالہ، فروری) اس معذرت خواہانہ بیان کے تجزیہ سے قطع نظر کیا علامہ محمد اقبال کے اسلامی افکار کے حوالے سے مولانا وحید الدین خان بھی وہی ”علمی طریقہ“ اختیار کرنے کی تکلیف گوارہ فرمائیں گے۔ یہ دہری پالیسی ہے کہ جب بات مولانا وحید الدین خان کی آئے تو ان کے ”سابقہ مطبوعات و افکار کو سامنے“ رکھا جائے اور اقبال کی آئے تو ان کے تمام سابقہ و متاخرہ افکار کو پس پشت ڈال کر دو چار اشعار کو ان کے اسلامی افکار کا نچوڑ گردان کر انہیں اسامہ بن لادن کے افکار کا جد امجد کہا جائے (الرسالہ نومبر ۲۰۰۷ء)۔ بات جان ایمان کے اسوہ و منہاج کی آئے تو آیت قرآن کی ناقص تفسیر کی جائے، مستند محدثین و مفسرین کو پس پشت ڈال کر اسوہ حسہ کے کاملیت کا منکر بن جائیں اور جب مولانا وحید الدین خان کی علمی کاملیت اور پختگی پر سوالیہ نشان لگنے کی بات آئے تو ان کے ”سابقہ“ مطبوعات کو ”سامنے“ رکھا جائے؟ یہ شخصیت پرستی کی بدترین مثال ہے۔ مولانا کے معتقد خاص کے مذکورہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے کہ علامہ اقبال کے حوالے سے مولانا وحید الدین کا طریقہ ”غیر علمی اور سطحی قسم کا دھوم مچانا ہے“۔ مولانا کی ذات پر و فیر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا یہ اقتباس بالکل فٹ ہوتا ہے:

”یہ امر واقعہ ہے کہ جب سے ملت اسلامیہ عالمی سطح پر ہمہ گیر زوال سے دو چار ہوئی ہے ہر میدان میں اس کی فکری اور عملی کمزیریاں اپنے اصل مرکز سے ہٹ گئی ہیں اور اگر کسی وقت احساس زیاں کا کچھ شعور رکھنے والے افراد کی طرف سے ملی سطح پر اس ہمہ گیر فکری اور عملی بگاڑ کی جزوی اصلاح کی کوششیں ہوئی بھی ہیں تو وہ کماتحاد کارگرنہیں ہو سکیں۔ کیونکہ ان میں سے اکثر میں کوئی نہ کوئی ایسی کمی ضرور رہ گئی ہے جس کے نتیجے میں اصلاح احوال کی بجائے مزید انجھنیں پیدا ہوئی ہیں اور عوام کی رہی سہی امیدیں بھی غم و یاس میں بدلتی چلی گئی ہیں۔“ (عشق رسول، صفحہ: ۱۵)

کاش خواتین پر بھی کوئی رسالہ نکلتا!

محمد آزاد حسین نقش بندی

مقام رامپور، ضلع اتر دیناج پور، بنگال

مولانا نورانی صاحب اہد یہ سلام مسنون، خیریت طرفین نیک مطلوب۔ ماہنامہ جام نور کے متعلق حال ہی میں جو کچھ ہوا اس معاملہ کو آگے نہ بڑھاتے ہوئے آپس میں محبت کا بھرا لیا جائے ورنہ اس اختلاف کا فائدہ اغیار کو پورا پورا ملے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ اسلام جس نے عورتوں کو ان کی فطرت کے مطابق انفرادی اور اجتماعی حیثیتوں سے گونا گوں حقوق عطا کیے ہیں، وہیں پر تصنیف و تالیف کے بھی حقوق عطا فرمائے ہیں، اس بات کی وضاحت ماضی کے مطالعہ سے ہوتا ہے (عہد ماضی میں تصنیف و تالیف کے ذریعہ بھی دختران اسلام نے خدمت علم و دین کی ہیں) دل میں یہ بات بار بار آتی ہے کہ کاش خواتین اسلام کے لیے ایک رسالہ اہل سنت و جماعت کی طرف سے وجود میں آجائے تو بہت اچھا ہوگا، یا جام نور جیسے ملت کا بے باک ترجمان میں ایک مستقل کالم خواتین اسلام کے لیے ہو تو اچھا ہوگا کہ جس میں ہماری ماؤں اور بہنوں کے خیالات و تخلیقات شائع ہوں تاکہ دختران اسلام میں اور زیادہ سے زیادہ تحریر کا شوق پیدا ہو اور اس سے جو فائدہ ہوگا وہ اہل علم سے مخفی نہیں ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ جام نور کا خصوصی شمارہ (تعارف سواد اعظم نمبر) نکالنے کا فیصلہ فرمایا ہے یقیناً یہ اہم کام ہوگا، جس میں تقریباً ہمارے اسلاف و اکابرین کی زندگی سامنے آئے گی اور ساتھ میں ان کی صحیح تعلیمات سے بھی لوگ روشناس ہوں گے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کام میں صبر و استقامت اور فیہ مدد فرمائے۔ آمین ثم آمین

یہ کوشش لائق صد ستائش ہے

مولانا ارشد شمسی

دارالعلوم حسینہ غوثیہ، میا بروج، کوکاتا

مولانا خوشتر صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ... اللہ عز و جل کے لطف و کرم اور اس کے مقربین کی نظر غایت کے طفیل سرزمین کلکتہ پر شاداں و فرحان ہوں، امید کہ آپ بھی مع احباب بخیر و عافیت ہوں گے۔ ان دنوں خانقاہ شمسہ ارول بہار کی ایک مستند شخصیت حضرت مخدوم ارشد رحمۃ اللہ

علیہ کی حیات و کرامات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب بنام ”تجلیات ارشد“ کی تیاریوں میں مصروف ہوں مگر پھر بھی مجھے نور سے سرور کرنے والا رسالہ ”جام نور“ جو کہ تمام دلوں کی دھڑکن بن چکا ہے اور جسے اکابر و اصغر کی حمایت و پشت پناہی حاصل ہے، کا مطالعہ بنظر غائر ایک مرتبہ ضرور کر لیتا ہوں، آپ کی جدت پسند طبیعت اور اپنی مکمل فکری توانائیوں کو صرف کر دینے کے باعث جام نور کے حسن میں دن بدن نکھار اور اس کے قارئین کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

فی الوقت ماہ جنوری ۲۰۰۸ء کا تازہ شمارہ ”جام نور“ میری نگاہوں کے سامنے ہے جس میں آپ نے ”تعارف سواد اعظم نمبر“ کا اعلان شائع کیا ہے۔ اس اعلان کو پڑھنے کے بعد بے حد مسرت ہوئی اور ایسا محسوس ہوا کہ شاید آپ نے جد امجد حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کی طرح دین و سنیت کی ترویج و اشاعت کے لیے اپنی خرمین ہستی کو فنا کر دینے کا عزم مصمم کر لیا ہے۔ مولا تعالیٰ آپ کو آپ کے مقصد میں کامیابی اور جہد متواصل میں استقامت عطا فرمائے (آمین) بلاشبہ یہ اپنی نوعیت کا منفرد اور تاریخی نمبر ہوگا جو کہ موجودہ اور تاحشر آنے والی نسلوں کے لیے بیش بہا تحفہ ہوگا۔ جب بھی کوئی بھارت کا مورخ رسائل و جرائد کی تاریخ رقم کرے گا، تو اس کا نام سرفہرست جلی حروف سے لکھے گا اور آپ کی مدحت سرائی کیے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ یہ کوشش لائق صد ستائش ہے۔

اللہ آپ کو استقامت بخشے

عزیز الرحمن فاروقی

فردوس ویشالی، ویشالی نگر، جوگیشوری (ویسٹ بمبئی)

مکرمی و محترمی جناب مولانا خوشتر نورانی صاحب! سلام مسنون..... امید ہے کہ مزاج شریف - بخیر و عافیت ہوں گے ماہنامہ جام نور کی پوری ٹیم مبارک باد کی مستحق ہے، جو ملت کی رہنمائی کر رہی ہے اور خاص طور سے اگر ہم میں کچھ کیاں ہیں ان کو بھی ایمانداری سے بیان کر کے بتاتی ہے۔ دراصل میں کوئی زیادہ پڑھا لکھا عالم یا اردو داں نہیں ہوں۔ لیکن جو کچھ بھی پڑھ لکھ لیتا ہوں وہ سب اللہ کی عطا اور اپنے شوق کی بنا پر ہی ہے۔ بہت سے اردو کے ماہنامے و رسالے پڑھنے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے۔ لیکن کسی بھی رسالے کو پورا پڑھنے کو دل نہیں کرتا ہے کیونکہ سب ایک ہی طریقہ کار کے ہوتے ہیں۔ لیکن جام نور اپنی مثال آپ ہے جس کو پورا پڑھنے کو دل کرتا ہے اور جس میں حقیقت بیانی ہوتی ہے اور ملت کا درد ہوتا ہے اور ملت کو بام عروج پر دیکھنا چاہتا ہے اور یہ سب جب ہی ہو سکتا ہے جب قوم کے دل میں اخلاص ہو۔ اللہ سے دعا ہے کہ زور قلم اور ہو۔ اور اللہ آپ سے اور بھی قوم و ملت کا کام لے اور آپ کے قدم مضبوطی کے ساتھ اس کام میں جمے رہیں، آپ نے جو کام ہاتھ میں لیا ہے اُس میں دشواریاں تو آئیں گی ہی لیکن آپ کو اس سے دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ میں تو اپنے دوستوں کو بھی بتاتا ہوں کہ اگر کوئی ماہنامہ منگاتا ہو تو جام نور منگا کر پڑھو۔

جام نور بار بار پڑھنے کے باوجود جی نہیں بھرتا

محمد شمیم راحت برکاتی

گورکھپور، یوپی

محبت مکرم حضرت ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ..... عرض مخصوص یہ ہے کہ میں ماہنامہ ”جام نور“ کا مستقل قاری تو نہیں مگر ہاں جب کسی بک اسٹال پر پہنچتا ہوں اور وہاں دیگر رسائل کے جھرمٹ میں ماہنامہ ہذا کو پاتا ہوں تو سب سے پہلے اسی کو ہاتھ میں لے کر اس کی جاذبیت پر سو جان سے قربان ہوتا ہوں اور پھر دکاندار کو قیمت چکا کر اے، ٹو، زید مطالعہ کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں، چونکہ جہاں اس کے ٹائٹل پیجز بڑے ہی دلکش اور دیدہ زیب ہوتے ہیں وہیں اس کے مضامین بھی بڑے وسیع اور معلومات افزا ہوتے ہیں، جو پہلی ہی نظر میں دل کو موہ لیتے ہیں اور جسے ہر بار پڑھنے کے باوجود بھی پھر ایک بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ بس یہ سب آپ کی ادارت کی کرشمہ سازی ہے۔ اللہ کرے آپ کی ادارت تا دیر قائم رہے۔ اور ماہنامہ روز و شب پھولے پھلے۔

برطانیہ میں اسلامی عائلی قوانین زیر بحث

مسلمانوں کو اسلامی عائلی قوانین پر عمل کرنے کی اجازت دی جائے: آرچ بشپ روون ولیمز

برطانوی قانون کا حصہ بنایا جائے وہ روزمرہ کے عمل کرنے کی چیزوں کا حوالہ دے رہے تھے۔ پھر رد عمل اس لیے بھی ہوا کہ ان دنوں اسلامی انہما پسندی اور دہشت گردی کے حوالے سے سخت تناؤ پایا جاتا ہے۔ آرچ بشپ نے چونکہ اپنی تقریر میں واضح زبان استعمال نہیں کی اس لیے اکثر عیسائیوں نے اسے غلط انداز میں لیا۔

آرچ بشپ کو مسلمانوں کے بارے میں تشویش کیوں ہوئی؟ انہوں نے اپنے پورے لیکچر میں بار بار وضاحت کی کہ وہ جو الیٹو اٹھا رہے ہیں ان کا اطلاق مساوی طور پر قدامت پسند یہودیوں اور دوسرے مذاہب پر بھی ہوتا ہے۔ ان سے سبھی متاثر ہوتے ہیں مثلاً رومن کیتھولک بچوں کو گود لینے والی ایجنسیاں ان بچوں کو ہم جنس پرست جوڑوں کو گود نہیں لینے دیں گی۔ اس طرح برطانیہ میں یہودیوں کی مذہبی عدالتیں کام کر رہی ہیں اور اگر کوئی یہودی جوڑا طلاق حاصل کرنے عدالت سے رجوع کرے تو عدالت ان کی ابتدائی طلاق کی ڈگری جاری کر دیتی ہے لیکن ان سے کہا جاتا ہے کہ مکمل طلاق ڈگری (Degree asolute) اس وقت جاری کی جائے گی جب وہ یہودی عدالت کو طلاق فراہم کریں گے، یوں اس عمل کو قانون میں سمویا گیا ہے چونکہ آرچ بشپ کا لیکچر ”برطانیہ میں اسلام“ کے موضوع پر تھا، اس لیے وہ دوسرے مذاہب کو زیر بحث نہیں لائے اور محض چند مثالیں دیں۔ آرچ بشپ نے واضح کر دیا تھا کہ وہ ایک متوازی سسٹم کی بات نہیں کر رہے تھے بلکہ یہ تجویز دے رہے تھے کہ اس سر زمین کا قانون کس طرح کارآمد طور پر اور بغیر تنازع دوسرے مذاہب کے روزمرہ کے عمل کو اپنے اندر جگہ دے سکتا ہے۔ وہ الگ مسلمان عدالتیں قائم کرنے کی وکالت نہیں کر رہے تھے۔ آرچ بشپ کی دلیل تھی کہ افراد کو انتخاب کرنے میں آزاد ہونا چاہئیں کہ وہ کس قانونی حدود کے اندر مخصوص معاملات طے کرنا چاہتے ہیں ان معاملات میں شادی، مالی معاملات، مصالحت اور تنازعات کے حل شامل ہیں۔

ڈاکٹر ولیمز کی دلیل کا اکثر باعمل مسلمانوں نے خیر مقدم کیا ہے۔

آرچ بشپ آف کنٹریری کے اسلامی شرعی قانون برطانیہ کے قانون میں سمونے کے بیان پر گزشتہ ہفتے ملک بھر میں بحث جاری رہی جو آنے والے دنوں میں بھی جاری رہے گی۔ بیان کے خلاف دائیں بازو کے میڈیا اور سیاست دانوں کا رد عمل اس قدر شدید تھا کہ وزیر اعظم گورڈن براؤن کو اس سے لاطعلق ظاہر کرنا پڑی۔ یہ مطالبہ کیا گیا کہ ڈاکٹر روون ولیمز کو برطرف کیا جائے۔ یہ فیصلہ صرف ملکہ ایلزبتھ ہی کر سکتی ہیں جو چرچ آف انگلینڈ کی سربراہ ہیں۔ ڈاکٹر ولیمز نے جس روز بیان دیا اس سے دو روز بعد سنڈے یعنی چرچ کی پارلیمنٹ کی کانفرنس شروع ہو رہی تھی اور عام توقع تھی کہ ڈاکٹر ولیمز کے خلاف بغاوت ہوگی لیکن اس کے برعکس سنڈے کے ارکان نے ان پر بھرپور اعتماد کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر اروون ولیمز آرچ بشپ ہی نہیں برطانیہ میں مختلف مذاہب خصوصاً عیسائیت، اسلام اور یہودی مذہب کے درمیان ڈائیلاگ بھی انہوں نے ہی شروع کیا اور انٹرفیٹھ کے حوالے سے گزشتہ تین سال میں خاصی پیش رفت ہوئی ہے۔

روون ولیمز کے بقول شرعی قانون کے بعض پہلوؤں کو برطانوی قانون میں سمویا جائے۔ یہ پہلو عائلی قانون سے متعلق ہیں جن پر مسلمان کمیونٹی کا ایک حصہ ایک عرصہ سے عمل کرتا آیا ہے۔ ان میں طلاق اور وراثت سے متعلق شرعی قانون ہے۔ ڈاکٹر ولیمز کا دعویٰ تھا کہ برطانیہ کے مختلف شہروں میں ان دنوں دو درجن سے زیادہ شرعی عدالتیں کام کر رہی ہیں جو مسلمانوں کو ان دنوں شادی بیاہ اور طلاق کے بارے میں مشورہ دیتی اور فتویٰ جاری کرتی ہیں۔ اگر اسے برطانوی قانون کا حصہ بنا دیا جائے تو تمام مسلمان اس سے مستفید ہو سکتے ہیں، لیکن طلاقیں کے بارے میں فیصلے برطانوی قانون کے تابع ہوں گے۔ اس بیان پر رد عمل اس لیے ہوا کہ مغربی ملک شرعی قانون کو متنازع سمجھتے ہیں اور باقی تمام چیزوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور عورتوں کے حقوق، سنگسار کرنے، ہاتھ کاٹنے قسم کی سزاؤں پر اپنے دلائل کی بنیاد رکھتے ہیں۔ آرچ بشپ نے یہ وکالت نہیں کی تھی کہ سخت اسلامی قوانین کو بھی

رکھا ہے اور اگر کسی مسلمان نے کسی ایسے ملک میں جہاں ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت ہے وہاں شادی کی ہے تو ان بیویوں کو برطانیہ میں سوشل سیکورٹی کے بینیفٹ حاصل کرنے کی اجازت ہے۔ بشرطیکہ وہ وزیر یا طالب علم کی بنیاد پر برطانیہ آگئی ہیں شوہر اور پہلی بیوی کو جوڑا تسلیم کیا جاتا ہے لیکن اس کے بعد کی بیویوں کو سوشل سیکورٹی کا بینیفٹ ملتا ہے اور شوہر چاروں کو ایک چھت تلے رکھنے کے لیے کونسل سے بڑی رہائش کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ برطانیہ میں ایک سے زیادہ شادیاں غیر قانونی ہیں لیکن حکومت مسلمانوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتی کہ یہ حساس معاملہ ہے۔

مسلمان رہنماؤں کا کہنا ہے کہ جہاں مالی فوائد کا معاملہ ہے حکومت سرمایہ کاری کے حصول کے لیے نت نئے قانون بنا رہی ہے اور کسی کو اعتراض نہیں ہوتا لیکن عائلی معاملات پر اسلامی قانون کے پہلوؤں پر اس قدر دوا دیا گیا جاتا ہے جیسے برطانیہ میں شریعت کا قانون نافذ کیا جا رہا ہے اور چوری پر ہاتھ نہیں گئے، جیسی جرائم پر سنگسار کیا جائے گا اور سنگین جرائم پر سزائیں دی جائیں گی۔ حالانکہ آج بپ اور بعض مسلمان لیڈر چاہتے تھے کہ اس ایشیو پر بحث شروع کی جائے یہ دہرے معیار کی ایک مثال ہے۔

مسلمان تنظیموں کا کہنا ہے کہ وہ عائلی قوانین کا ایک عرصہ سے مطالبہ کرتے آئے ہیں ان سے کسی دوسرے مذہب کے قانون یا حقوق کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ اگر مسلمان اپنی کمیونٹی کے اندر شادی، طلاق اور وراثت کے معاملات اپنے مذہب کے مطابق نمٹانا چاہتے ہیں، یہ ان کا استحقاق ہونا چاہیے۔ عیسائی یا یہودی مسلمانوں پر کچھ اور مسلط کیوں کریں؟ مغربی ملکوں کو مسلمان ملکوں سے بہت سی چیزیں سیکھنا ہوں گی۔

بعض مسلم رہنماؤں کی دلیل ہے کہ آج بپ کے لیکچر پر غیر ضروری طور پر برطانوی سیاست دانوں نے شدید رد عمل کا اظہار کیا ہے حالانکہ حکومت نے ان کی روزمرہ کی زندگی میں شرعی چیزوں کو تسلیم کر رکھا ہے۔ مثلاً حلال گوشت جو اب مسلمان بچوں کو اسکولوں میں بھی فراہم کیا جاتا ہے۔ بعض اسکولوں میں مسلمان بچوں کے لیے الگ اسبلی ہوتی ہے جو مسلمان لڑکیاں حجاب استعمال کرتی ہیں انہیں اس کی اجازت ہے۔ اسی طرح بعض دوسرے اسلامی پہلوؤں پر عمل کرنے کی بھی اجازت ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود حکومت نے مسلمانوں کے مالی معاملات کے حوالے سے متعدد قوانین بنائے ہیں اور اب برطانیہ کے تمام بڑے بینک اسلامی مارکیٹ جاری کرتے ہیں۔ ان کے پیسے سرمایہ کاری غیر شرعی مصنوعات میں نہیں کی جاتی۔ مسلمانوں کے لیے الگ اکاؤنٹ کھولے جاتے ہیں۔ ان میں رقم اسلامی طریقے سے رکھی جاتی ہے۔ اسلامی اصولوں کے مطابق کام کرنے والے نئے بینکوں کو اجازت دی گئی ہے۔ کئی مقامی بینک اسلامی بانڈ "سک" جاری کرتے ہیں۔ اسلامی سرکاری کی لندن میں بہت حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے اور اسے دنیا کے لیے گیٹ وے بنانے کے منصوبے پر عمل ہو رہا ہے۔ لندن اسٹاک ایکس چینج پر مسلمان کمپنیاں لسٹ کی جا رہی ہیں۔ اسلامی مالی مارکیٹ کا مغرب میں اندازہ 304 بلین ڈالر لگایا گیا ہے۔ برطانیہ میں ابھی تک اس کا حصہ 25 بلین پونڈ ہے۔ برطانیہ اسلامی سرکاری کی کشش کے لیے جو اقدام کر رہا ہے، اب یورپی یونین اس کی تقلید کر رہی ہے اور اسلامی بینک اب فرانس اور جرمنی میں بھی قائم کیے جا رہے ہیں، مسلمانوں کی ایک سے زیادہ بیویوں پر برطانیہ یا مغربی ملکوں کو اعتراض ہے اور خود آج بپ نے بھی اس پہلو کی مخالفت کی ہے۔ لیکن موجودہ حکومت نے بغیر اعتراض کیے اسے قبول کر

جام نور کی نئی مطبوعات منظر عام پر

کربلا کا مسافر

مرتب: مولانا مشتاق احمد نظامی علیہ الرحمہ

تقدیم: مولانا ارشد القادری علیہ الرحمہ

صلی اللہ علیہ وسلم

غزوات میں معجزات رسول

مصنف: سید فیاض حسین شاہ

خاک کربلا (ہندی)

علامہ ارشد القادری کی بے مثال خدمات کے چند ابتدائی اوراق

۱۹۲۵ء سے ۱۹۵۰ء تک

ارشاد کی کہانی ارشد کی زبانی

ترتیب و ایڈیٹنگ: خوشتر نورانی ص: ۶۴، قیمت: ۲۵

شرعی عدالت

اس کالم میں آپ شرعی امور سے متعلق کوئی بھی سوال مفتی صاحب قبلہ کو خط لکھ کر پوچھ سکتے ہیں، آپ کے سوالات اور مفتی صاحب کے جوابات ہر ماہ اس کالم میں شائع ہوا کریں گے۔ شرعی عدالت کے لیے آپ اپنے سوالات اس پتے پر ارسال کریں:-
مفتی آل مصطفیٰ مصباحی، استاذ جامعہ امجدیہ رضویہ، گھوسی ضلع منٹو (یوپی)

جہیز، رویت ہلال اور امامت کے احکام

صورت مسئلہ میں امام صاحب توبہ کر چکے ہیں لیکن درمیانی نے توبہ نہیں کی ہے، درمیانی پر کیا حکم ہے شریعت کا؟ تحریر فرما کر عند اللہ ماجور ہوں، پھر مسائل کی نیت اختلاف کی ہے تو اس پر کیا حکم ہے؟ تحریر فرمائیں۔

(۲) مسائل نے تیسرا سوال رویت ہلال کے تعلق سے قائم کیا، وہ محض کذب اور غلط بیانی سے کام لیا ہے ہم سنی بریلوی مسلک اعلیٰ حضرت کے ماننے والے ہیں، ہمارا اعتقاد اس بات پر ہے کہ موبائل، ٹیلیفون وغیرہ قابل اعتبار نہیں، ہاں موبائل وغیرہ سے خبریں لیتے ہیں پھر شہادت شرعیہ حاصل کرنے کے بعد ہی اعلان ہوتا ہے اور ایسا ہی ہوا بھی ہے تو کذب و افتراء پھیلا کر اختلاف کرنا اور واقعہ کے خلاف سوال قائم کر کے جواب لینا کیسا ہے؟

(۳) دو گروپ میں سے اول گروپ نے ایک عید گاہ میں اپنے متعینہ وقت پر نماز عید ادا کر لی دوسرے گروپ والے ٹھیک اسی جگہ پر جہاں پر امام اول نماز پڑھا چکے تھے دوسری جماعت کے لیے امام کھڑا کر کے نماز ادا کی تو اب سوال یہ ہے کہ گروپ دوم کی نماز ہوئی یا نہیں؟ واضح فرمائیں۔

(۴) سوال نمبر ۴ (استفتاء میں) جس حافظ کے تعلق سے استفتاء کیا گیا ہے وہ حافظ پرانے حافظوں میں سے ہیں، تلاوت مایہوز بہ الصلوٰۃ ہوتی ہے التہ تجوید و قرأت کی کتابیں نہیں پڑھیں مگر تلفظ کی ادائیگی ہوتی ہے جس سے فساد معنی نہیں ہوتا تو ایسے حافظ کے پیچھے نماز پڑھنے کا کیا مسئلہ ہے؟ جواب سے نوازیں۔

المستفتی — محمد شمشاد علی، محمد حیدر علی، محمد اسلم، عتیق احمد، وحی احمد، محمد مناظر احمد، محمد اظہار، عبدالغفور

جواب:- (۱) مفتی کا کام صورت مسئلہ کا جواب دینا ہے۔ واقعہ کی تحقیق اس کے فرائض سے نہیں، اگر مسائل واقعہ کی غلط تصویر پیش

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمادین و مفتیان شرع متین درج ذیل مسائل کے بارے میں کہ (۱) دارالعلوم امجدیہ رضویہ گھوسی کے دارالافتاء میں مورخہ ۵ رذی الحجہ ۱۴۲۷ھ کے ایک استفتاء کا جواب آج ۸ ریشوال ۱۴۲۸ھ کو نظر سے گزرا، اس میں مسائل نے جو سوال کیا اس کی حقیقت یہ ہے کہ امام صاحب نے مطالبہ جہیز نہیں کیا، ایک لڑکی والے نے از خود جہیز دیا، ہاں درمیانی نے لڑکی والے سے بات کر کے رقم طے کر دی اور امام صاحب کے حوالے کر دیا لہذا امام صاحب اس بات کو ناجائز سمجھتے ہوئے علانیہ توبہ اپنے سفر حج کی روانگی سے قبل الوداعیہ پروگرام میں گاؤں کے سارے مسلمانوں کے بیچ یوں کیا کہ مجھ سے آج سے پیشتر قصداً سہواً جو بھی غلطیاں اور خطائیں ہوئیں ان سبھوں سے میں توبہ کرتا ہوں اور آپ حضرات کا بھی کوئی حق مجھ پر ہو تو آپ حضرات بھی معاف فرمادیں، اس توبہ کی تاریخ ۲۱ رذیقعدہ ۱۴۲۷ھ ہے تو اب جبکہ امام مذکور اپنی گزشتہ خطاؤں سے نادم ہو کر اپنے طور پر خود ہی قوم کے سامنے تائب ہوئے نہ کسی کے دباؤ سے، پھر مسائل کا اس بات پر بضد رہنا کہ امام صاحب توبہ کریں کہاں تک درست ہے؟ — مسائل کے سوال سے بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ یہاں گاؤں والے سنی صحیح العقیدہ ہیں جس وقت جہیز کا لین دین سامنے آیا اس لین دین میں درمیانی شخص خود مسائل کے والد ہیں، امام صاحب کے گروپ والوں کا کہنا ہے کہ امام صاحب توبہ کر چکے ہیں جس پروگرام میں ہم دونوں گروپ والے بالکل یک شریک تھے اور امام صاحب کے گروپ کے لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب بھی میل ملاپ اتحاد و اتفاق کی بات ہوتی ہے تو اک نیا گوشہ نکال کر فریق ثانی اختلاف کو بڑھا دیتا ہے اور یہ فتویٰ منگوا کر ہونے والے اتحاد کو پھر اختلاف کی شکل میں بدل دیتا ہے۔ اب

کر کے جواب لیتا ہے تو اس کا وبال و گناہ اس پر ہے، کسی امر ناجائز کا ارتکاب بھی ناجائز ہے اور اس کا بلا واسطہ یا بالواسطہ مطالبہ بھی ناجائز ہے۔ جہیز کے نام پر بطور شرط جو لین دین رواج پا چکا ہے اس کے ناجائز ہونے میں کلام نہیں۔ بلکہ فقہانے اسے رشوت قرار دیا ہے۔ درمختار میں ہے: "أخذ أهل المرأة شيئا عند التسليم فللزوج أن يسترده لانه رشوة" رد المحتار میں ہے: "قوله عند التسليم بان أبي أن يسلمها أخوها أو نحوه حتى يأخذ شيئا وكذا لو أبي أن يزوجهما فللزوج الاسترداد قائما أو هالكا لانه رشوة" (ج: ۳، ص: ۳۰۷)

اگر امام مذکور نے مطالبہ جہیز نہیں کیا۔ بلکہ درمیانی نے طے کر کے امام کے حوالے کر دیا تو امام کا اس رقم کو لینا، اس عمل پر راضی رہنا خود آپ لوگوں کی تحریر سے ثابت ہے۔ رہی امام مذکور کی توبہ، توجہ سے قبل اجمالی طور پر سارے گناہ سے توبہ کر لینا کسی متعین گناہ سے توبہ کے لیے کافی نہیں، خاص کی گناہ کی توبہ بھی خاص ہونی ضروری ہے مال حرام واپس دیئے بغیر اس گناہ سے توبہ نہ ہوگی قال اللہ تعالیٰ "ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل" فتاویٰ رضویہ میں ہے "اس پر واجب کہ جن سے لیا انہیں پھیر دے اگر کھا چکا ہو تو اپنے پاس سے دے بغیر اس کے اس گناہ سے توبہ نہ ہوگی"

درمیانی جس نے یہ رقم طے کرائی اس پر بھی لازم کہ کچی توبہ کرے اور جبکہ یہ معاملہ طشت از بام ہو چکا تو تنہائی کی توبہ کافی نہ ہوگی علانیہ کرنی ہوگی۔ حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "إذا عملت سيئة فاحدث عندها توبة السر بالسور والعلانية بالعلانية" جب کوئی گناہ کرے اس وقت توبہ کرے خفیہ کی خفیہ اور علانیہ کی علانیہ۔ دلوں کا حال مولیٰ عزوجل بہتر جانتا ہے، ہمیں ظاہر کا حکم ہے الحکم علی الظاہر واللہ یتولی السرائر اگر مسائل کی نیت فتویٰ حاصل کر کے اختلاف وقت کی ہو تو یہ سخت حرام بلکہ اس قتل سے بھی سخت بتایا گیا "والفتنة اشد من القتل" اور فتنہ قتل سے بڑھ کر ہے۔ والعیاذ باللہ تعالیٰ۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۲) ٹیلیفون، موبائل وغیرہ سے ہلال کی خبر لینا ممنوع نہیں۔ اگر واقعی ان آلات سے محض اطلاع حاصل کی گئی۔ اور نماز عید کے بعد ثبوت شرعی بطریق شرعی ادا کی تو یہ ٹیلیفون یا موبائل پر اعتبار کرنا

نہ ہوا بلکہ ثبوت شرعی پر اعتبار ہوا اور یہی حکم شرع ہے تو یہ خلاف شرع نہ ہوا۔ مسائل نے اگر جان بوجھ کر غلط واقعہ لکھ کر استفتاء کیا ہے تو وہ فتنہ پرداز، گنہگار، مستحق غضب جبار ہے اس پر لازم کہ اپنی اس حرکت بد سے توبہ کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۳) صورت مسئلہ میں جس کا امام شرعاً امام عید تھا یعنی وہ قاضی شرع کا مقرر کردہ یا بضرورت وہاں کے عام مسلمانوں کا معین کیا ہوا تھا۔ اور اس نے قاضی شرع کے اعلان کے بعد نماز پڑھائی، اس کی اور ان کے پیچھے پڑھنے والوں کی نماز صحیح ہوگئی اور جو امام ایسا نہیں نہ اس کی نماز عید ہوئی اور نہ اس کے پیچھے پڑھنے والوں کی۔ فتاویٰ رضویہ (ج: ۳، ص: ۷۲۳) میں ہے "نماز جمعہ وعیدین مثل عام نمازوں کے نہیں جسے چاہا امام کر دیا نماز ہوگئی ان کے لیے ضرور ہے کہ امام خود سلطان اسلام ہو یا اس کا مقرر کردہ اور یہ نہ ہوں تو بضرورت وہاں کے عام مسلمانوں نے جسے امامت جمعہ کے لیے معین و مقرر کیا ہو تو ان تینوں جماعتوں میں جس کا امام معین و مقرر کردہ جمعہ تھا اس کی اور اس کے مقتدیوں کی نماز ہوگئی باقیوں کی نہیں اور اگر کسی کا امام ایسا نہ تھا تو کسی کی نہ ہوئی، مثلاً سربراہ مسجد ہے دس بارہ راگیر گزرے ایک نے آگے ہو کر نماز جمعہ پڑھائی پھر کچھ اور آئے انہوں نے بھی ایسا ہی کیا یوں دس بیس جماعتیں ہوئیں جمعہ ایک کا بھی نہ ہوا اور فرض ظہر سب کے فمرد رہا درمختار میں ہے الجمعة يشترط لصحتها السلطان أو مأموره بابقا متها ونصب العامة غير معتبر مع وجود من ذكر اما مع عدمه فيجوز للضرورة اه ملقطا واللہ تعالیٰ اعلم

(۴) نماز کی صحت کے لیے امام کا صحیح القراءۃ ہونے میں آپ لوگوں کا اختلاف ہے تو محض استفتاء حاصل کر لینے سے اس کے پیچھے نماز پڑھنے والوں کی نماز صحیح یا باطل نہیں ہو جائے گی۔ اس کا مدار واقعی قرأت کی صحت اور غلطی پر ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ کسی ایسے قرأت جاننے والے، متدین عالم یا قاری سے جانچ کر وائیں اگر صحیح پڑھتا ہے اور دیگر شرائط امامت بھی پائے جاتے ہوں تو اس کے پیچھے نماز پڑھیں، ورنہ نہیں، حکم شرع میں ان کا کو دخل دینا گناہ بھی ہے اور شریعت پر جبری بننا بھی۔ والعیاذ باللہ۔ واللہ تعالیٰ اعلم

□□□

معروف دانشور پروفیسر اختر الواسع سے خصوصی ملاقات

صدر شعبہ اسلامیات جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

پروفیسر اختر الواسع جہاں دانش و بینش کا ایک معروف و متعارف نام ہے، مسلم مسائل موصوف کی فکر و قلم کا محور ہیں، اعتدال و توازن ان کی باتوں کا خاصہ ہے، عصبیت اور جانب داری کی بجائے حقیقت پسندی اور رواداری ان کی ترجیحات ہیں، پروفیسر صاحب کا وطن علی گڑھ ہے، علی گڑھ سے ہی گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کی تکمیل کی، استنبول یونیورسٹی سے ۱۹۸۳ء میں ترکی میں ڈپلوما کیا۔ ۱۹۷۸ء سے ۱۹۷۹ء تک جامعہ ملیہ میں لیکچرر رہے، ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۰ء تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں لیکچرر رہے، ۱۹۸۰ء میں پھر جامعہ چلے آئے، ۱۹۸۷ء میں ریڈر بنے، ۱۹۹۱ء میں پروفیسر کے منصب پر فائز ہوئے، اس کے بعد ادارہ علوم انسانی کے ڈین بھی رہے اور فی الوقت صدر شعبہ اسلامیات اور ڈائریکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز ہیں، اس کے علاوہ مولانا آزاد یونیورسٹی حیدرآباد، انڈین وقف کونسل دہلی، کشمیر یونیورسٹی، کشمیر، مسلم یونیورسٹی گڑھ، آل انڈیا قومی تنظیم دہلی، وغیرہ دور درجن تعلیمی، ملی، سیاسی، سماجی، صحافتی اور فلاحی اداروں اور تنظیموں سے وابستہ ہیں، تصنیف و ترجمہ اور تہذیب پر مشتمل تقریباً ایک درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جامعہ کے تین علمی جرنل "Islam & the Modern Age"، "اسلام اور عصر جدید" اور رسالہ "جامعہ" آپ کی ادارت اور نگرانی میں شائع ہو رہے ہیں۔ رضویات پر بھی اچھی نظر ہے، مولانا آزاد یونیورسٹی حیدرآباد کے اسلامیات کے پرچہ میں اپنی کوشش سے تحریکوں میں اہل سنت و جماعت (سنی بریلوی تحریک) اور شخصیات میں امام احمد رضا خاں محدث بریلوی کی شخصیت کو شامل کرایا ہے اور اس کے لیے خود ہی لکھا بھی ہے۔ اعلیٰ حضرت محدث بریلوی کی تحریک پر اپنی نگرانی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بھی ایک Ph.D کر رہے ہیں۔ مختلف علمی، فکری اور سیاسی و سماجی موضوعات پر موصوف کا لیا گیا انٹرویو یونڈر قارئین ہے۔

خوشتر نورانی

معلومات حاصل کریں پھر کوئی رائے قائم کریں، رائے قائم کرنے کی ہر شخص کو آزادی ہے اور اس آزادی پر قدغن نہیں لگائی جاسکتی لیکن سنی سنائی بات پر، تحفظات و ذہنی کو لے کر تعصب کی بنیاد پر کسی کے بارے میں وہ خواہ مسلم ہو، یا غیر مسلم، کوئی رائے قائم نہیں کرنا چاہیے۔

معاف کیجیے گا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے تظہیر کی جو راہ نکالی تھی بعد کے لوگوں نے اس راہ پر چلنے کی زحمت نہیں کی، شاہ صاحب کا نام سب لیتے ہیں لیکن ان کی پیروی کرنے کی ہمت کسی میں نہیں، گویا شاہ صاحب کی ذات وہ وزنی پتھر ہے جسے چوتھے سب ہیں لیکن انہیں کوئی اٹھانے کے لیے تیار نہیں۔ اس رویہ سے مجھے لگتا ہے کہ ان لوگوں کا نقصان تو نہیں ہوتا ہے جن کے تعلق سے عصبیت برتی جاتی ہے لیکن اس سے ہندوستان کے اندر اسلام اور مسلمانوں کا غیر معمولی نقصان ہوا ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی کا معاملہ بھی یہی ہے کہ وہ غیر معمولی علمی تبحر کی حامل شخصیت ہیں، ان کی دین کی جو تعظیم ہے وہ اپنے زمانے میں انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ علمی اعتبار سے دیکھیے تو دیکھ رہے ہیں کہ ایک شخصیت کتنے علوم و فنون کی حامل

سوال: (۱) ہفت روزہ عالمی سہارا کے "اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی نمبر" میں آپ نے ارباب علم و دانش کو رضویات کے حوالے سے سنجیدہ مطالعہ اور غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے، آپ ایک غیر جانب دار اسکالر ہونے کی حیثیت سے بتائیں کہ آپ اعلیٰ حضرت محدث بریلوی سے کیسے متعارف ہوئے اور ان کے تعلق سے کیا رائے قائم کی؟

جواب: - دیکھیے! جب آپ اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے ہندوستان کا بلکہ جنوبی ایشیا کا مطالعہ کریں گے تو آپ اعلیٰ حضرت کو نظر انداز ہی نہیں کر سکتے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے بعد دور جدید میں مختلف مکاتب فکر اور مسلک و جود میں آئے اور بڑی بڑی شخصیات پیدا ہوئیں، ان میں اعلیٰ حضرت محدث بریلوی کی شخصیت بہت ہی نمایاں اور اہم ہے اور ان کی اعتبار سے منفرد بھی۔ اور دیکھیے علم کی دنیا میں تعصب کی کوئی گنجائش نہیں، تعصب علم کی نفی ہے، کسی شخصیت کے بارے میں تفریق و امتیاز کی بنیاد پر یا ذہنی تحفظات کی بنیاد پر رائے قائم کر لینا سراسر غیر علمی رویہ ہے اور صرف غیر علمی نہیں غیر اسلامی رویہ بھی ہے۔ دیانت کا تقاضا ہے کہ کسی بھی شخصیت کے بارے میں پہلے پوری

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں
سیدھی سادی بات ہے جو اقبال نے کہی ہے
یہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر یہ اونہ رسیدی تمام بولہبی ست

ہمارے نزدیک اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام وہی ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ سب بولہبی ہے۔ اس لیے معیار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے جو قرآن ناطق ہے، تو قرآن متلو اور قرآن ناطق یہ ہیں معیار، اور یہی اعلیٰ حضرت کے معیار تھے، مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی یہی کہا کہ اگر وہ ہمارے مخالف تھے تو عشق رسول کی بنیاد پر تھے۔ تو سچی بات یہی ہے کہ اعلیٰ حضرت کے یہاں کوئی ذاتی خصامت نہیں ہے، حسد نہیں ہے، بغض و کینہ نہیں ہے، جن کو رسول اللہ پیارے تھے وہ احمد رضا کو پیارے تھے۔ بس۔

سوال (۳): مولانا آزاد یونیورسٹی (حیدرآباد) میں اب میڈیکل اور دوسرے جدید شعبوں کا آغاز ہو رہا ہے جس میں اردو میڈیم سے طلبہ تعلیم حاصل کر سکیں گے، اس تعلق سے سوال یہ ہے کہ اردو سے Pass Out ہونے والے میڈیکل کے طلبہ کا مستقبل کیسا ہوگا؟ نیز کیا اس تجربے کو دوسری یونیورسٹیوں میں دہرایا جانا مناسب ہے؟

جواب: سب سے پہلے میں یہ وضاحت کر دوں کہ میرا تعلق مولانا آزاد یونیورسٹی سے بہت محدود دینا ہے، اس کا جو فاصلاتی کورس ہے اس کے شعبہ اسلامیات سے میرا رشتہ ہے، اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں، لیکن جہاں تک اس کا سوال ہے کہ انہوں نے میڈیکل اردو میڈیم سے کرانے کا ارادہ کیا ہے تو یہ کوئی بری بات نہیں اور نہ پریشان ہونے کی بات ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ یہ آسان ہے لیکن اتنی مشکل بھی نہیں جسے سر نہ کیا جاسکے۔ ویسے یہ تجربہ آج سے بہت پہلے ۱۹۱۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے ساتھ ہی کیا جا چکا ہے۔ وہ لوگ آج بھی موجود ہوں گے جو اپنے پیشے سے جڑے ہوئے ہوں گے۔ انہوں نے اردو سے میڈیکل کیا پھر مزید تعلیم حاصل کی اور پھر کامیاب علاج و معالجہ شروع کیا تو یہ کوئی نیا تجربہ نہیں ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اس طرح کے سوالات

ہے، آج کے دور میں یک رخ پن کو شخص کا نام دے کر تو قیر بخشنے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن ان کو دیکھیے تو وہ صحیح معنوں میں بحر العلوم تھے، پھر ان کا عشق رسول کتنا بڑا سرمایہ ہے جس پر وہ سب کچھ قربان کر دینے کو تیار ہیں۔ اس کے باوجود کسی بھی شخص کو اختلاف رکھنے کا حق حاصل ہے، لیکن اختلاف کا حق ہے عناد کا نہیں، اختلاف تو خیر ہے، خود اعلیٰ حضرت کے جو نیاز مند ہیں، پیروکار ہیں ان لوگوں نے بھی بہت سی چیزوں میں ان سے اختلاف کیا ہے۔ لیکن یہ اختلاف حدادب میں ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ آپ کے جو افکار ہیں، خیالات ہیں، نظریات ہیں ان کے جملہ حقوق آپ اپنے پاس رکھیں، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تلاش کریں کہ وہ کون سی مشترکہ بنیادیں ہیں جہاں ہم میں اختلاف نہیں ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں فاضل بریلوی کسی ایک مسلک یا مکتب فکر کے نمائندہ کے طور پر نہ دیکھے جائیں بلکہ ہندوستان میں بلکہ جنوبی ایشیا میں جو اسلام اور مسلمان ہیں ان کے تابناک نمائندہ اور روشن مثال کے طور پر انہیں دیکھا جانا چاہیے۔ اور چوں کہ آپ سے گفتگو کر رہا ہوں اس لیے یہ اضافہ بھی کرنا چاہوں گا کہ اس سلسلے میں کام کرنے کی زیادہ ذمہ داری ان کی ہے جو اعلیٰ حضرت کے ماننے والے ہیں کہ وہ لوگوں کو ان کی طرف لانے کی کوشش کریں نہ کہ دوری پیدا کریں۔

سوال (۲): ڈاکٹر اوشا سانپال کی تحقیقی کتاب Devotional Islam & Politics in British India آپ نے پڑھی ہوگی جو چند سالوں قبل آکسفورڈ پریس سے چھپی ہے، اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ مولانا احمد رضا خاں نے کتاب وسنت کو اپنا معیار بنایا تھا، ان کے زمانے میں جتنی تحریکیں انھیں ان میں امام احمد رضا خاں نے اپنے معیار کے اعتبار جو بھی نقص پایا، اس کا تعاقب کیا، اس سلسلے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب: ان کا معیار کہنا غلط ہے، اعلیٰ حضرت کا کوئی اپنا اختراعی معیار نہیں تھا، میں یہ بات ارادی طور پر کہہ رہا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ یہ بات اہل علم کے بیچ اور عالم لوگوں تک پہنچے۔ اعلیٰ حضرت بریلوی کا کوئی اپنا اختراعی معیار نہیں تھا، ان کا معیار کتاب وسنت تھا، اس معیار پر جو آیا، انہوں نے اسے قبول کیا اور کتاب وسنت کے معیار پر جو نہیں اترا اس کا تعاقب کیا اور کون شخص ہوگا جس کا اس پر ایمان نہیں ہوگا۔

ہوئے ہیں اور اب مزید کرنے کی ضرورت ہے۔
پھر اردو سے میڈیکل کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوائیوں کے نام بدل کر اردو میں کر دیے جائیں، بیماریوں کے نام بدل دیے جائیں، جو اصطلاحات ہیں وہ تو انگریزی میں ہی رہیں گی صرف میڈیم بدلے گا اور اس طرح کا اگر کوئی تجربہ ہوتا ہے تو اس سے ہم پریشان کیوں ہوں ہمیں تو اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔

سوال (۴): یو جی سی کے ذریعہ منعقد ہونے والا NET کا امتحان اس سے پہلے اردو میڈیم سے بھی دینا ممکن تھا لیکن اب کچھ ماہ قبل اس پر پابندی لگ گئی جو اردو والوں کے لیے اور مسلمانوں کے لیے بڑی تشویش کی بات ہے، اس سلسلے میں آپ کیا کہتے ہیں کیا یہ پابندی ختم کی جاسکتی ہے؟

جواب: میں تو اس سلسلے میں بہت پہلے رجسٹرڈ خط لکھ چکا ہوں، لیکن اس کے ساتھ یہ بتاؤں کہ یہ صرف جامعہ اسلامیہ کا مسئلہ نہیں ہندوستان کی ان تمام یونیورسٹیز کا مسئلہ ہے جن میں اسلامیات یا اردو کا شعبہ ہے، اس کے لیے سب کو مشترکہ کوشش کرنی چاہیے، میں جب تک یو جی سی کے پروگرام سے وابستہ تھا، اس وقت تک اس طرح کی کوئی مصیبت نہیں تھی، دراصل بات یہ ہے کہ جو ہمارے ذمہ دار ہوتے ہیں انہیں ان چیزوں کی فکر نہیں ہوتی، وہ بالکل بے فکرے ہوتے ہیں، ہمیں سوچنا چاہیے کہ آخر یہ سب کیوں ہوتا ہے؟ میں نے بہت تیکھا خط لکھا تھا، دوسروں کو بھی اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے، اس کے خلاف تو ہمارے پاس ایک اور دلیل ہے، وہ یہ کہ جو طلبہ اردو ذریعہ تعلیم سے پڑھ رہے ہیں ان سے یہ کہنا کہ آپ NET کا امتحان اردو میں نہ دیں یہ کہاں کا انصاف ہو سکتا ہے، دوسری بات یہ کہ مولانا آزاد یونیورسٹی میں مثال کے طور پر، جو استاذ مقرر ہوں گے وہ ظاہر ہے کہ اردو میڈیم میں پڑھانے والے ہوں گے تو اب وہ اساتذہ کہاں سے آئیں گے جو NET کا امتحان بذریعہ اردو دیے ہوں گے؟

حاصل کلام یہ کہ میں اس سمت میں کوشش کر رہا ہوں، ظاہر ہے ایک آدمی کے کرنے سے کچھ نہیں ہوتا، ضرورت اس بات کی ہے کہ دوسرے لوگ بھی اس سمت میں پیش قدمی کریں اور اپنی آواز بلند کریں تاکہ ان کا حق انہیں ملے، بصورت دیگر اس سے اردو کے طلبہ اور ان طلبہ کو جو مدارس سے آتے ہیں بہت نقصان اٹھانا پڑے گا۔

ہمارے ذہن میں کہیں کسی مرغوبیت کی وجہ سے تو نہیں اٹھتے ہیں، ہم نے یہ کیوں فرض کر رکھا ہے کہ میڈیکل یا دوسرے عصری علوم صرف انگریزی سے ہی حاصل کیے جاسکتے ہیں، بھائی انگریزی کی عملداری کب سے ہے؟ ۲۵۰ سال سے، ۲۵۰ سال پہلے جب تاج محل بنایا گیا تھا، جب قطب مینار کی تعمیر ہوئی تھی، دہلی کی شاہجہانی مسجد اور لال قلعے کی تعمیر ہوئی تھی تو ان کے لیے Architecture کی کون سی انگریزی اصطلاح تھی؟ ان کے بنانے والے کون تھے؟ وہ کس آکسفورڈ اور کیمبرج سے پڑھ کر آئے تھے؟ وہ سب مدرسے کی پیداوار تھے، اب ہماری تن آسانی ہے، کسالت ہے، احساس کمتری اور مرغوبیت ہے، ہماری بزدلی ہے کہ ہم نے میدان چھوڑ دیا ہے، آپ میڈیکل کی بات کر رہے ہیں آپ یہ کیوں نہیں غور کرتے کہ کیا بوعلی بن سینا کی کتاب القانون فی الطب انگریزی میں ہے جسے میڈیسن کی بائبل کا درجہ آج بھی حاصل ہے اور آج بھی اس پر ریسرچ جاری ہے اور اس کا لکھنے والا کیا کوئی انگریز تھا؟ پتہ چلا کہ جب تک آپ میں جوش تھا، ذوق و شوق تھا، جب تک آپ میں ہمت موجود تھی، دنیا آپ کی علمی فتوحات سے بہرہ مند ہو رہی تھی اور استفادہ کر رہی تھی لیکن تاریخ کا المیہ ہے کہ کیا خبر تھی کہ وہ زمانے بھی ہیں آنے والے سوتے رہ جائیں گے دنیا کو جگانے والے اردو میڈیم سے میڈیکل کا کورس آسان نہیں لیکن کرنا چاہیں تو کیوں نہیں ہوگا؟ مسلمانوں پر جو ادبار و زوال ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بقول مولانا محمد علی جوہر

حد ہے پستی کی کہ پستی کو بلندی جانا

اب بھی احساس ہو اس کا تو ابھرنا ہے یہی

اصل مسئلہ یہ ہے کہ آپ پستی میں پڑے ہوئے ہیں اور عقل کل سمجھے ہوئے ہیں، جاہل ہونا اتنا خطرناک نہیں ہے جتنا جاہل آدمی کا اپنے کو قابل سمجھنا، یہ جہل مرکب افراد کو اور قوموں کو دونوں کو ختم کر دیتا ہے، ہماری بد نصیبی یہ ہے کہ ہم جہل مرکب کا شکار ہیں۔ پھر اردو کے تعلق سے بھی جو غلط فہمیاں ہیں انہیں دور کرنے کی ضرورت ہے، اردو کسی مذہب کی زبان نہیں، وہ صرف کسی تہذیب کی ترجمان نہیں، وہ صرف شعر و شاعری کی زبان نہیں اور نہ صرف افسانہ اور قصے کہانیوں کی زبان ہے، اردو علمی زبان بھی ہے، اس سے پہلے بھی اس میں علمی کام

سوال (۵): - موجودہ دور میں جب کہ انسان روحانیت سے مادیت کی طرف بھاگ رہا ہے، ایسے میں تصوف کی کیا اہمیت و معنویت ہے؟

جواب: - آپ احسان کہیں، تزکیہ نفس کہیں، عرفان کہیں یا تصوف کہیں، آپ اس کا کوئی نام دیں، یہ عہد رسالت سے چلا آرہا ہے، اے کے ساتھ میں یہ بھی کہوں گا کہ تصوف مادیت کی نفی نہیں کرتا بلکہ اس کی بجائے وہ انسان کو مادیت میں غرق ہونے سے بچاتا ہے، تو آج ایک ایسی دنیا میں جہاں اسراف بے انتہا بڑھ گیا ہے، جہاں انسان جو Social Animal تھا اسے Economic Animal بنا دیا گیا ہے اور ایسے دور میں جہاں قلب و نظر کی جگہ صرف معدے کو دے دی گئی ہے، انسان کو صرف اور صرف خواہشات نفس کا پتلا بنانے کی ہر طرف سے کوشش ہو رہی ہے، تصوف کی ضرورت کل سے زیادہ ہے۔ دوسرے یہ کہ انسان کے اندر سے صلہ رحمی کا جو فقدان ہوتا جا رہا ہے، انسان رشتوں کے تقدس کو جس طرح فراموش کر رہا ہے، انسان جس طرح سے اپنی ذات میں سمٹتا ہی نہیں جا رہا ہے بلکہ اپنی ذات کے گرد طواف کو سب کچھ سمجھے ہوئے ہے ایسے وقت میں تصوف ناگزیر ہے۔ اگر آپ کو انسانیت کو ہلاکت سے بچانا ہے، جنت سے نکلنے کے آدم کے بیٹے جس طرح دنیا کو جہنم بنا رہے ہیں اگر اسے جہنم بننے سے بچانا ہے تو آپ کے پاس تصوف کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

ایک بات کی اور وضاحت کرتا ہوں کہ کچھ لوگ تصوف کو طریقت سمجھتے ہیں اور شریعت سے ماورا سمجھتے ہیں، میرے نزدیک طریقت اور شریعت دونوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہے۔ تصوف کیا ہے وہ واضح رہنا چاہیے، سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی سے کسی نے پوچھا حضرت میں صوفی بننا چاہتا ہوں، انہوں نے کہا کہ بس آٹھ خصلتیں اپنے اندر پیدا کر لو، صوفی بن جاؤ گے (۱) ایثار (۲) اطاعت (۳) اشارہ (۴) صوف (۵) قناعت (۶) صبر (۷) غربت اور (۸) فقر۔ پھر اس کی وضاحت فرمائی کہ ایثار جیسا حضرت ابراہیم میں تھا، اطاعت ایسی جیسی اسماعیل کی تھی، اشارہ ذکر یا جیسا، صوف موسیٰ جیسا، قناعت عیسیٰ جیسی، صبر ایوب جیسا، غربت یحییٰ جیسی اور فقر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا جسے انہوں نے اپنا فقر قرار دیا۔ تو صحیح معنوں میں صوفی بننا آسان بھی نہیں ہے، آٹھ جلیل القدر

پیغمبروں کی خصلتوں کی پیروی کے بعد یہ رتبہ ملتا ہے، یہی وجہ ہے کہ سب لوگ اس کی ہمت نہیں کر پاتے۔

سوال (۶): - ہندوستانی مسلمانوں کے بنیادی اور اہم مسائل کون سے ہیں؟

جواب: - اس سوال کے ذریعے ہم اور آپ ایک خطرناک وادی میں داخل ہو رہے ہیں، بہت ہی پیچیدہ سوال کر دیا آپ نے۔ اصل بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے پچھلے سو سالوں میں ہمیشہ مقررہ کو لیڈ بنایا ہے مگر کو لیڈ نہیں بنایا۔ اور معاف کیجیے گا اکثر لوگ جنہیں قیادت کا شوق ہے ان کو شجاعت اور حماقت کے بیچ جو باریک فرق ہے اس کا ادراک نہیں ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ وہ شجاعت کے زعم میں مسلمانوں کو ہمیشہ حماقت کی سرحدوں میں داخل کر دیتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک بات اور اہم ہے، وہ یہ ہے کہ مسلم قیادت نے مسلمانوں کو ہمیشہ ادھوری سچائیوں میں زندہ رکھا اور یہ خیال رکھیے کہ ادھوری سچائی سفید جھوٹ سے زیادہ ہلاکت خیز ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ہماری قیادت نے مسلمانوں کو یہ تو بتایا کہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ کون سا لوہا کون سے لوہے کو کاٹتا ہے۔ ٹھنڈا لوہا ہمیشہ گرم لوہے کو کاٹتا ہے، گرم لوہا جب بھی ٹھنڈے لوہے سے ٹکراتا ہے خود اپنی شکل منسوخ کر لیتا ہے۔ ہماری ساری کوششیں اور کاوشیں گرمی تفریر، گرمی محفل اور گرمی جذبات سے ہیں۔

ہم نے مسلمانوں کو ایک اور ادھوری بات بتا رکھی ہے، وہ ہے والقدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ، جو بھی اچھا یا برا ہوتا ہے وہ تقدیر سے ہوتا ہے اور وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ میرا بھی ایمان ہے اس پر اور جس کا ایمان نہ ہو اس پر وہ مسلمان نہیں ہے، لیکن یہ ادھوری سچائی ہے، اور یہ ادھوری سچائی اس فرمان الہی کے ساتھ مل کر پوری ہوتی ہے، لیس للانسان الا ماسعی - والقدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ یعنی انسان کو کچھ نہیں ملتا اس کی کوشش کے بغیر لیکن جو کچھ اچھا یا برا ہوتا ہے وہ تقدیر کا ہوتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ آپ صرف اس کو نظر کے سامنے رکھیے کہ سب کچھ تقدیر سے ہے تو کیا ہوگا ہاتھ بچ توڑ کر بیٹھے رہیں گے۔ تو مسلمانوں کی یہ بہت بڑی کمزوری ہے۔

اور جب بات چل ہی نکلی ہے تو مجھے ایک تیسری بات بھی کہنے دیجیے، خوگر مدح سے ذرا تھوڑا سا اور گلے سن لیجیے۔ ہم ماضی میں جینے کے

سارے طالب علم مسلمان تھے اور سارے اساتذہ کافر تھے، بدر کے موقع پر، اور آپ نے جو یہ فرمایا ہے کہ حکمتِ مومن کی گمشدہ پونجی ہے اسے جہاں یا وہاں سے لے لو، اسے عمل کر کے دکھایا، اسی لیے میں کہتا ہوں کہ جب تعلیم کی بات آئے تو طالب علم کا مذہب دیکھو اور استاد کی مہارت اور قابلیت پر نگاہ رکھو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مسلمانوں کو دوسرا معیار دیا ہے وہ ہے تجارت، یہ اہل فیصلہ ہے کہ جس کے ہاتھ میں مڈی ہوتی ہے اس کے ہاتھ میں مڈی ہوتی ہے۔ جب تک آپ دنیا میں تجارت کر رہے تھے آپ کے سر پہ تاج تھا، آپ نے تجارت کو چھوڑا تاج سے محروم ہو گئے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت کی اتنی تاکید کیوں فرمائی؟

چوں کہ مسلمانوں کے مسائل پر بات چل رہی ہے اس لیے ایک بات اور عرض کر دوں کہ ہماری پریشانی یہ ہے کہ ہمارے سیاسی رہنما ہوں یا مذہبی رہنما، وہ تمام جدید (Modern) میڈیم کو استعمال کر رہے ہیں لیکن ان کا Idiom آج بھی عہدِ وسطی والا ہے، انہوں نے اپنے لہجے کو نہیں بدلا۔ ہر زمانے کی اپنی لفظیات ہوتی ہے، ایک ذہنی سطح ہوتی ہے، اس کو مد نظر رکھے بغیر جو بات آپ کریں گے اگر وہ اچھی ہوگی جب بھی موثر نہیں ہوگی۔ لوگوں کی ذہنی سطح کو مد نظر رکھ کر باتیں کرنے کا حکم تو ہمیں حدیث سے ملا ہے، اس لیے میں مسلم رہنماؤں کو اس سمت بھی توجہ دلا نا ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنا لہجہ، لفظیات اور انداز گفتگو بدلیں، یہ زمانہ نہ مناظرے کا ہے اور نہ ہی مجادلے کا، یہ مکالمے کا دور ہے۔ اس سے بہت کر آپ اس دور کے لوگوں کو متاثر نہیں کر سکتے، اس کے ساتھ دعوتی نقطہ نظر سے یہ بات عرض کر دوں کہ آپ کا کام Communicate کرنا ہے Convert کرنا آپ کا کام نہیں ہے، اس لیے ہمیشہ ڈنڈا اٹھانے کی کوشش مت کیجیے۔

ایک آخری بات یہ عرض کر دوں کہ جب تک ہم میں خود اعتمادی اور خدا اعتمادی تھی، ہم سب کے قریب آنے کی کوشش کرتے تھے اور جب سے خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کو کھویا ہے ہم سب سے دور ہونے کی کوشش کرنے لگے ہیں، بھاگنے لگے ہیں کہ کہیں دوسروں کا سایہ نہ پڑ جائے، جبکہ دعوتی نقطہ نظر سے خیر امت ہونے کے لحاظ سے تو ہمیں دوسروں کے بہت زیادہ قریب آنے کی ضرورت ہے۔

سوال (۷):۔ مدارس سے یونیورسٹیز آنے والے طلبہ سے

عادی ہو گئے ہیں، ماضی کے تحفظ کا میں بھی قائل ہوں، اپنے ماضی سے رشتہ توڑنے کے لیے میں بھی تیار نہیں ہوں، لیکن ماضی میں ہی زندہ رہنا اور حال سے بے گناہ اور مستقبل سے بے فکر رہنا، یہ قوموں کو کہیں کا نہیں چھوڑتا، یہ کہتے رہنا اور فخر کرتے رہنا کہ اس ملک کو ہم نے قطبِ مینار کی بلندی دی، تاج محل کا حسن دیا، لال قلعہ کی چٹنگی دی، شا جہاںی مسجد کا تقدس دیا، معین الدین اور نظام الدین کا عرفان عطا کیا، یہ کب تک کام دے گا، آپ یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ جب تک یہ سب آپ دیتے رہے آپ ہی کوطل الہی سمجھا جاتا رہا، اب آپ دوسروں کو کیا دے رہے ہیں کہ کوئی آپ کو کچھ گردانے؟ اور دینا تو بڑی بات آپ تو لینا نہیں جانتے، لینے کے نام پر بھی لفظی انتقام لیتے ہیں۔ تو یہ ہیں ہمارے مسائل، ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم کون تھے اور کہاں تھے اور اب کیا ہیں اور کہاں ہیں؟ مسلمانوں کے حقیقی مسائل یہ ہیں، اس پورے فکری سانچے کو، پوری عملی روش کو جب تک آپ نہیں بدلیں گے کوئی چیز نہیں بدلے گی۔

مسلمانوں کو ایک اور بات سمجھ لینا چاہیے کہ دنیا کا کوئی نظریہ، کوئی فلسفہ اور کوئی پالیسی ان کے کام نہیں آئے گی، زندہ قوموں کی کامیابی کے لیے سراپا رحمت جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دو معیار دیے ہیں وہی دنیا کے دوسرے لوگوں کے بھی کام آئے ہیں اور وہی آپ کے بھی کام آئے ہیں اور آئیں گے، اور وہ دو معیار ہیں تعلیم اور تجارت۔ جس کے پاس تعلیم ہوتی ہے، علم ہوتا ہے، روز آفرینش ہی یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ اس کے سامنے دوسروں کو جھکنا پڑے گا، فرشتے نہیں جانتے تھے اور آدم جانتے تھے اسی لیے فرشتوں کو آدم کا سجدہ کرنا پڑا، اس طرح خالق کائنات نے اسی روز یہ قانون بنا دیا کہ جو نہیں جانتا ہے اسے جانتے والے کے سامنے جھکنا پڑے گا۔ جب تک آپ جانتے تھے ساری دنیا آپ کے سامنے جھک رہی تھی اور جب آپ کچھ نہیں جانتے رہے ہو تو آپ خوار پھر رہے ہو اور ہر کس و نا کس کے سامنے جھک رہے ہو۔ یہ ہمارا فکری دیوالیہ ہے کہ ہم نے علم کو دین اور دنیا میں بانٹ دیا، علم کی تو ایک ہی تقسیم ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے، علم نافع اور علم غیر نافع۔ ایک بات بڑی ذمہ داری سے عرض کروں گا کہ تاریخِ انسانی میں صرف جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ شرف و امتیاز حاصل ہے کہ آپ نے ایک ایسا نظامِ تعلیم قائم کیا جس میں

آپ کا تعارف ہوتا رہتا ہے، اب تک آپ نے ان کی نفسیات اور صلاحیتوں کا جو مطالعہ کیا ہے اس کی روشنی میں بتائیں کہ عصر حاضر کے چیلنجز کو مد نظر رکھتے ہوئے انہیں آپ کیا مشورہ دیں گے؟

جواب:- ایک بات میں برابر کہتا رہتا ہوں کہ ہم نے مدارس کے دروازے جامعہ کے لیے اس لیے نہیں کھولے ہیں کہ مدارس سے آنے والے طلبہ دنیا کے رنگ میں رنگ جائیں اور اپنی شناخت کھودیں۔ میں ہمیشہ اس کی تاکید کرتا ہوں، دوسری بات یہ ہے کہ ان طلبہ نے جو اپنی روش بنا رکھی ہے کہ وہ اردو، عربی، اسلامک اسٹڈیز اور فارسی کے علاوہ دوسرے شعبے کی طرف رخ ہی نہیں کرتے انہیں اپنی روش اور انداز فکر بدلنا ہوگا۔ کیوں کہ جتنی عربی وہ یہاں بی اے اور ایم اے میں پڑھتے ہیں اتنی عربی وہ مدرسے میں پڑھ کے آئے ہوتے ہیں اردو کا بھی یہی معاملہ ہے۔ مدارس کا جب یونیورسٹیز سے الحاق ہوا، خاص طور سے ہمارے بزرگوں نے مدارس کے لیے جب جامعہ ملیہ کا دروازہ کھولا تو ان کے سامنے یہ بات تھی کہ مدارس سے آنے والے طلبہ انسانی علوم اور سماجیات زیادہ سے زیادہ پڑھیں، بقیہ تو یہ پڑھ کر آتے ہیں، انہیں سب سے زیادہ زور انگریزی پر اور دوسرے سماجی علوم پر دینا چاہیے کہ وہ دینیات تو پڑھ کے آتے ہیں اگر وہ انگریزی اور دوسری یورپی زبانیں سیکھ لیتے ہیں اور دوسرے سماجی علوم کا گہرا مطالعہ کر لیتے ہیں تو ان کو مادی فوائد حاصل ہوں گے اور ہمیں روحانی فوائد، مادی فوائد انہیں کیسے حاصل ہوں گے یہ تو بتانے کی ضرورت ہی نہیں اب رہا ان سے ہمیں روحانی فوائد کیسے ملیں گے؟ تو وہ اس طرح کے وہ طلبہ دین اور دنیا کا اپنے اندر امتزاج پیدا کر لیں گے، دین تو پہلے سے سیکھے ہوئے ہیں جب وہ دنیا کو بھی حاصل کر لیں گے تو وہ دین اور دنیا کے بیچ جو خلیج ہے اس پر پل کا کام کریں گے اور رفتہ رفتہ پھر یہ ہوگا کہ یہ چیلنج ہی ختم ہو جائے گی۔ وہ دین کی اعلیٰ سطح پر خدمت بھی کریں گے اور دنیاوی جاہ و جلال بھی انہیں حاصل رہے گا۔

اصحاب مدارس اور ذمہ داران مدارس سے ایک گزارش یہ کروں گا کہ انہوں نے اردو کو تعلیم کی زبان تو بنا رکھا ہے لیکن اردو کا کوئی پرچہ وہاں نہیں ہوتا، اگر کوئی اردو کا پرچہ بھی شامل ہو جائے تو یہ بہت ہی اچھا رہے گا، میں نے بعض لوگوں سے اس سلسلے میں گفتگو کی تو وہ کہنے لگے کہ جناب آپ یہ چاہتے ہیں کہ مدارس میں فسق و فجور پڑھایا

جائے۔ سوال ہے کہ آپ امر القیس کو کیوں پڑھتے ہو، وہ کتنا بڑا اصل اور متقی تھا، جتنی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو نبوت تک کا دعویدار ہے، آپ اسے پڑھا رہے ہو۔ بہر حال لسانیات کی درستی کے لیے اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ آخر میں کہوں گا کہ جو طلبہ مدارس سے یونیورسٹیز آ رہے ہیں انہیں اس طور پر اپنی تیاری کرنی چاہیے کہ ان کے ایک ہاتھ میں جام شریعت ہو تو دوسرے میں سندان عشق۔ اور اگر سرسید کی زبان میں کہنے کی اجازت دیں تو ہمارے طلبہ کے دائیں ہاتھ میں فلسفہ ہو، بائیں میں سائنس ہو اور سر پر کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج ہو۔ یہ نئے دور میں تعلیمی مثالی مسلم نوجوان کی مثال ہے جس کو جو دین لانے کی کوشش ہونی چاہیے۔

سوال (۸):- اسلام پر آج زیادہ کام کرنے والے غیر مسلم ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس پر آج زیادہ تر کام مفتی نوعیت کا ہو رہا ہے، ایسے میں اسلامیات کا شعبہ سب سے مضبوط ہونا چاہیے اور اسلامیات کے طلبہ کو بڑے طاقت ور اور باصلاحیت فوجی ہونا چاہیے تاکہ وہ دفاع کا کام بخوبی کر سکیں لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے، کہا جاتا ہے کہ اسلامیات میں وہی طلبہ جاتے ہیں جن کا داخلہ دوسرے شعبوں میں نہیں ہوتا، آخر اس مسئلے کا حل کیا ہے؟

جواب:- یونیورسٹیز کے اندر دراصل Raw Product آتا ہے اور ہم اس کی Finishing کرتے ہیں، آپ اگر بالو بھیجیں گے تو ہم اسے سینٹ نہیں بنا سکتے، ہمارے پاس تو جو Product آتا ہے اسے Finishing Tuch دے کر اپنی مہر لگا دیتے ہیں، لیکن ایک بات کا خیال رکھیے کہ صد فی صد ایک نمبر کا مال نہ تو کوئی مدرسہ تیار کرتا ہے اور نہ کوئی یونیورسٹی، سارے مدارس شاہ ولی اللہ پیدا نہیں کیے، ندوہ سے نکلنے والے سب سید سلیمان ندوی نہیں بنے اور نہ ہی بریلی سے آنے والے سب مولانا امجد علی اعظمی بنے۔ تو بہت زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اسی مقدار سے معیار بھی آئے گا، آپ مقدار کو برامت کیسے ہاں معیار کو بہتر بنانے کی کوشش کیجیے۔ یاد رکھیے جب تک دودھ نہیں ہوگا مکھن کہاں سے نکالیں گے؟

اس کے ساتھ یہ بھی ذہن میں رہے کہ سارے غیر مسلم مفتی کام ہی نہیں کر رہے ہیں، بہت سے غیر مسلم بہت ہی معروضی، شہت اور علمی انداز میں کام کر رہے ہیں، اس لیے میں بہت زیادہ پریشان نہیں ہوں

بقیہ: پیکائش — سائنسی تفسیر کے موافقین و مخالفین کی آراء کا تجزیہ و محاکمہ کے بعد موصوف نے ”قرآن اور سائنس میں تعارض کی حقیقت“، ”سائنسی تفسیر میں بعض بے اعتدالیاں“، ”سائنسی تفسیر کے رواج کے اسباب“ اور ”سائنسی تفسیر کے جواز کے لیے کچھ شرائط“ نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ رقم کیے ہیں، یہ ساری باتیں صرف ۶ صفحات میں سما گئی ہیں اور خاص بات یہ کہ کوئی ضروری گوشہ تشنہ بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد ”غیر مقبول سائنسی تفسیر کی کچھ مثالیں“ دی ہیں، اس ذیل میں تین مثالیں ہیں، پہلی آیت کریمہ ”و یقذفون بالعیب من مکان بعید“ (الہباء: ۵۳) کی تفسیر ٹیلی فون، ٹیلی گراف، ٹی وی اور ریڈیو وغیرہ سے، دوسری مثال ہے دلیہ لارض (النمل: ۸۲) کی تفسیر سٹیلٹ سے اور تیسری مثال ہے، سبج سموات کی تفسیر سات سیاروں یا مختلف قسم کی گیسوں کی سات تہوں وغیرہ سے، فاضل اجل مولانا اسید الحق قادری نے نہایت عالمانہ انداز و اسلوب اور دلائل و براہین سے ان تفاسیر کو رد کیا ہے اور ان کے اندر جدید مفسرین نے جو کچھ تان کی ہے اسے اجاگر کیا ہے۔

کتاب کے مندرجات میں ایک چیز کی کمی رہ گئی ہے، وہ یہ کہ جس طرح غیر مقبول سائنسی تفاسیر کی مثالیں دی گئی ہیں مقبول سائنسی تفاسیر کی کچھ مثالیں بھی دی جانی چاہیے تھیں، اس کی احساس مولف موصوف کو بھی ہے جس کا اظہار انہوں نے ”پیش لفظ“ (ص: ۷) میں کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ ایک مستقل مقالہ لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں جس کا ہمیں شدت سے انتظار ہے۔

کتاب اسے موضوع پر مکمل ہونے کے ساتھ کئی دوسری جہتوں سے بھی اہم ہے، علمی مباحث کو عام فہم اسلوب میں پیش کرنے کی مثالیں آج کل کم ملتی ہیں، یہ ان میں ایک اچھی مثال ہے، زبان و بیان کے حوالے سے تو کچھ کہنا ہی نہیں ہے، اس سلسلے میں مولانا اسید الحق کا ہمزاد ابوالفیض معینی برصغیر میں پچل پچا چکا ہے، صرف ایک لفظ ”سنہ ثالثہ“ ایسا تھا جس پر نظر رکھی، خیال آیا کہ ممکن ہے کہ مولانا اسید الحق ازہری نے ”پیش لفظ“ آخر آخر میں لکھا ہو اور اتنی فرصت نہ ملی ہو کہ وہ ابوالفیض معینی حیدر آبادی کو بغرض اصلاح دکھلا سکتے، خبر یہ بھی ضروری تھا تا کہ لوگوں کو پتہ چلے کہ اسید الحق صرف بدایونی نہیں ازہری بھی ہیں۔ □□□

اور اس لیے بھی نہیں ہوں کہ اگر وہ منہی کر بھی رہے ہیں تو اس کے پس پردہ بھی اسلام کی عظمت اجاگر ہو رہی ہے۔ یعنی اسلام اس اہمیت کا حامل ہے ان کے نزدیک کہ وہ اس پر عرق ریزی کریں۔ وہ اسلام کو غیر معمولی طاقت کا حامل سمجھ رہے ہیں، پھر یہ کہ یہ تو کوئی نئی بات بھی نہیں، شروع سے ایسا ہی رہا ہے، بقول اقبال

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز

چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

تو شرار بولہبی تو شروع سے ہے، ہاں اس کا نام، انداز اور طریق کار مختلف رہے ہیں لیکن چراغ مصطفوی بجھا نہیں ہے وہ روشن ہی ہوتا گیا ہے۔ بغداد پہلی دفعہ نہیں لوٹا گیا ہے، لیکن ہلا کو کہاں ہے کوئی نہیں جانتا اور بغداد آج بھی موجود ہے اور ایک بات اور یاد رکھیے کہ جو دین اور جو امت سانحہ کر بلا کے بعد زندہ ہے، سقوط بغداد کے بعد زندہ ہے، برصغیر میں ۱۸۵۷ء اور ۱۹۳۷ء کے بعد زندہ ہے، ۱۹۹۲ء اور ۲۰۰۲ء کے بعد زندہ ہے وہ آگے بھی زندہ رہے گی، کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ صرف اپنے رویے کو بدلنے کی ضرورت ہے مسلمانوں کو، اور وہ یہ ہے کہ صحیح معنوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ پر عمل کریں، پھر دیکھیں ہر چیز ان کی ہوگی، ان شاء اللہ۔

سوال (۹): ماہنامہ جام نور کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

جواب: خوشی کی بات یہ ہے کہ اہل سنت و جماعت جسے ہم سنی بریلوی تحریک بھی کہتے ہیں، کے یہاں غیر معمولی بیداری آئی ہے، ادھر ان کی سرگرمیاں بڑھی ہیں، نئے مدرسے وجود میں آئے ہیں، لٹریچر پر کام ہو رہا ہے، کئی اچھے رسالے نکل رہے ہیں، یہ بہت ہی خوش آئند بات ہے، ان کی بعض چیزوں سے اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے، لیکن مجھے اس بات سے خوشی ہے کہ ادھر ان میں خوشگوار، مثبت پیش رفت دیکھ رہا ہوں، جام نور کا مضمون کا اجتہاد و تقلید پر خصوصی شمارہ دیکھا، اس میں آپ نے ہر مکتب فکر کو نمائندگی دی ہے، یہ توسع مجھے پسند آیا، عصر حاضر میں مکالمے کا یہی تقاضا ہے، خوشتر نورانی اپنے جدا مسجد کا علمی مشن آگے بڑھا رہے ہیں اور میں اسے صرف ہندوستان نہیں برصغیر بلکہ جنوبی ایشیا میں اسلام اور مسلمانوں کے مسائل کے لیے نیک فال تصور کرتا ہوں۔ میں بہت پر امید ہوں۔

□□□

تقدیر کی نیرنگیاں

میرے والد حافظ قرآن تھے۔ طب کے پیشے سے وابستہ تھے اور اپنے آبائی قصبہ سہوان میں مطب کیا کرتے تھے۔ انہوں نے ہجرت کے بعد شہر اوکوٹ سندھ میں رہائش اختیار کی اور اپنے پرانے مطب کے نام سے دواخانہ قائم کیا۔ یہ واقعہ تقریباً بیس سال پہلے کا ہے۔ ایک شخص دواخانے کے قریب آکر ٹھٹھک گیا اور آنکھوں پر ہاتھوں کا ہتھک بنا کر غور سے دواخانے کا بورڈ پڑھنے لگا۔ میں اتفاق سے دواخانے کے دروازے پر کھڑا تھا، میں اسے غور سے دیکھنے لگا۔ بورڈ پڑھ کر وہ جھجکتے ہوئے مجھ سے پوچھنے لگا ”کیا آپ اسی دواخانے کے مالک ہیں؟“

میں نے جواب دیا کہ یہ میرے والد صاحب کا دواخانہ ہے۔ وہ کہنے لگا، ہندوستان میں بھی اسی نام سے ایک دواخانہ تھا، میں نے جواب دیا کہ قصبہ سہوان میں میرے والد صاحب نے اسی نام سے دواخانہ کھولا ہوا تھا۔ وہ پُر جوش ہو کر پوچھنے لگا کیا آپ مجھے اپنے والد صاحب سے ملا سکتے ہیں؟ میں نے کہا، وہ اس وقت کھانا کھانے اوپر گھر میں گئے ہوئے ہیں۔ آپ مطب میں بیٹھیں میں انہیں بلاتا ہوں، وہ شخص کہنے لگا، میں ان سے اوپر ہی چل کر مل لوں گا۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ والد صاحب سے عمر میں کافی چھوٹا لگ رہا تھا، اس لیے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ والد صاحب سے اس کا کیا رشتہ ہے۔ وہ ان سے ملنے میں کیوں اتنا بے تاب ہے۔ میں نے اس کا نام پوچھا، اس نے اپنا نام بتا کر کہا کہ آپ اپنے والد صاحب کو یہ نام جا کر بتا دیں۔ وہ مجھے خود بلا لیں گے اور واقعی ایسا ہی ہوا، جیسے ہی میں نے والد صاحب کو نام بتا کر کہا کہ یہ شخص آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ والد صاحب کھانا کھاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے، اسے فوراً اوپر لے آؤ، یہ کہاں سے آ گیا۔

میں اسے اوپر لے آیا، وہ والد صاحب سے بچوں کی طرح لپٹ کر ملا، انہوں نے اصرار کر کے اسے کھانے میں شریک کر لیا اور اس سے اس کے گھر کے حالات پوچھتے رہے، میں انہیں باتیں کرتے دیکھ کر نیچے چلا آیا، بہت دیر بعد وہ رخصت ہونے لگا تو ابا جان اسے نیچے

چھوڑنے کے لیے آئے۔ کھانے کے بعد وہ قیلولہ ضرور کرتے تھے، مگر اپنے اس خاص مہمان کی خاطر انہوں نے قیلولہ بھی چھوڑ دیا تھا، جب وہ چلا گیا تو مجھ سے رہانہ گیا، ان سے اس مہمان کے بارے میں پوچھا، وہ کہنے لگے، میاں تم بہت چھوٹے تھے، جب یہ سہوان میں میرے پاس مددگار کے طور پر کام کرتا تھا۔ یہ بارہ سال کا تھا، جب اسے اس کا چچا یہ کہہ کر ہمارے یہاں چھوڑ گیا تھا کہ یہ یتیم بچہ ہے، اسے اپنے پاس رکھ کر کام سکھا دیں، یہ تب سے میرے مطب میں کام کر رہا تھا اور سچ پوچھو تو مجھے بچوں کی طرح عزیز تھا۔ میری غیر موجودگی میں وہ مطب کو بڑی خوش اسلوبی سے سنبھالے رکھتا تھا، اسے میرے ساتھ کام کرتے ہوئے تقریباً پندرہ سال ہو چکے تھے، وہ جوان ہو گیا تھا، اس لیے میں نے اسے گھر میں لانا بند کر دیا تھا اور مطب کے ساتھ کمرے میں اس کی رہائش کا بندوبست کر دیا تھا۔ اکثر میرے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ یہ ایسی زندگی کب تک بسر کرے گا، اس زمانے میں پاکستان بننے کی تیاریاں آخری مراحل میں تھیں اور میں نے دل میں یہ ٹھان لی تھی کہ میں پاکستان ضرور جاؤں گا۔ اس صورت میں اس ملازم کو کہاں رکھوں گا۔ بہر حال میں نے سب کچھ اللہ ہی پر چھوڑ دیا تھا۔ مجھے بچپن سے ہی بزرگان دین سے دلی عقیدت تھی، حضرت شاہ ولایت سے مجھے ایک خاص لگاؤ تھا، میں فرصت کے اوقات میں ان کے مزار پر حاضری دینے ضرور جاتا تھا۔ وہاں سے آتے ہوئے راستے میں قبرستان پڑتا تھا۔ میں کچھ دیر وہاں بھی اپنے بزرگوں کی قبروں پر فاتحہ خوانی کے لیے ٹھہر جایا کرتا تھا۔ اس زمانے میں قبرستانوں میں روشنیوں کا کوئی بندوبست نہیں ہوتا تھا۔ لوگ دن میں بھی وہاں جانے سے ڈرا کرتے تھے۔

ایک رات چاند اپنے شباب پر تھا، ہر سو چاندنی کا راج تھا۔ میں مطب بند کرنے لگا تو خیال آیا کہ بہت دنوں سے حضرت شاہ ولایت کے مزار پر حاضری نہیں دی۔ اپنے اس ملازم عزیز اللہ سے کہا کہ وہ میرے ساتھ چلے۔ ہم فاتحہ خوانی کے بعد لوٹ آئیں گے، یہ میرے ساتھ ہولیا۔ مزار سے واپسی پر حسب عادت میں قبرستان میں آ گیا

زور سے رونے لگی۔ اس کے رونے پر ہمیں سو فی صد یقین ہو گیا کہ یہ عورت واقعی کسی مجبوری کے عالم میں جا دو ٹوٹا کرنے آئی تھی، اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ یا پونے بارہ کا وقت ہوگا۔ یہ بھی خوف تھا کہ ہمارے علاوہ کوئی اور یہاں آ گیا تو اس منظر کو دیکھ کر کسی غلط فہمی کا شکار ہو سکتا تھا، میں نے عزیز اللہ سے کہا، چلو یہاں سے نکل چلتے ہیں، یہاں تو ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ عزیز اللہ کہنے لگا، حکیم صاحب یہ عورت پریشان حال لگتی ہے، ہمیں اسے اس کے گھر تک پہنچا کر آنا چاہیے، میری مخالفت کے باوجود وہ آگے بڑھا اور عورت سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور یہاں کیا کرنے آئی تھی؟

عورت نے پہلے ہچکچاہٹ سے کام لیا، مگر عزیز اللہ کا ہم دردانہ لہجہ اسے اس صورت حال کی تفصیل بتانے پر مجبور کر گیا۔ اس نے بتایا کہ اس کی شادی کو سات سال ہو گئے، والدین نے بہت چھوٹی عمر میں اسے بیاہ دیا تھا، وہ دونوں چند سال بعد انتقال کر گئے تھے، میکے میں اس کا کوئی عزیز نہیں اور بد قسمتی سے اس کی کوئی اولاد نہیں ہوئی، اس کی ساس بہت ظالم ہے اور وہ اپنے بیٹے کی دوسری شادی کی تیاریاں کر رہی ہے۔ پہلے شوہر اس کا ساتھ دیتا تھا، مگر اولاد سے قطعی مایوس ہونے پر وہ بھی اپنی ماں کے کہنے پر دوسری شادی کر رہا تھا۔ اس نے ایک پیر کے کہنے پر چالیس روز کا یہ عمل شروع کیا تھا کہ قبرستان میں پیری کے درخت کے نیچے چالیس روز رات کے وقت جا کر نہائے۔ اولاد کی چاہت میں وہ یہ خوف ناک عمل کرنے پر تیار ہو گئی۔ شوہر اور ساس کے سو جانے پر وہ یہ عمل کرنے دو میل پیدل چل کر یہاں آئی تھی۔ قریب کے کنویں سے پانی ہالٹی میں لیا اور نہانا شروع ہی کیا تھا کہ ہم لوگوں نے آکر اس کا عمل توڑ دیا، کیوں کہ پیر صاحب نے یہ تاکید کی تھی کہ اگر نہاتے ہوئے کسی نے اسے دیکھ لیا تو اس کا بتایا ہوا عمل ٹوٹ جائے گا، وہ اس کا پہلا روز تھا، یہ کتنا سنا کر وہ پھر رونے لگی۔

ہم نے یہ مشکل اسے چپ کر لیا، اس سے کہا کہ وہ کپڑے پہن لے، ہم اس کے گھر تک اسے چھوڑنے چلیں گے اور اس کے شوہر کو سمجھائیں گے۔ وہ بڑی تسلیوں اور دلا سوں کے بعد اپنے گھر جانے پر رضا مند ہوئی، مگر جب اس کے گھر کے دروازے پر پہنچے تو اس کی ساس اور شوہر دہلیز پر کھڑے تھے۔ شوہر اس کی غیر موجودگی میں جاگ گیا تھا۔ اس نے اپنی ماں کو بھی اٹھا دیا تھا، جب ہم اس کی بیوی کو لے کر

خلاف توقع اس روز عزیز اللہ کچھ چپ چپ سا تھا، میں نے پوچھا تو کہنے لگا: صاحب اکثر سوچتا ہوں کہ پاکستان بن گیا تو آپ سب پاکستان چلے جائیں گے، میرا کیا بنے گا، میرا تو کوئی اپنا بھی نہیں ہے، میں کس کے پاس جاؤں گا۔

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ تمہارے چچا کو تلاش کر رہا ہوں، وہ مل گیا تو تم اس کے پاس چلے جانا، ویسے اگر بندوبست ہو گیا تو ہم تمہیں بھی ساتھ لے چلیں گے۔ یہ بات میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے کہی تھی، وہ بھی سمجھ گیا تھا، ہم خاموشی سے قبرستان کے پتھروں پہ چل رہے تھے، قبرستان کے آخری سرے پر والد صاحب اور دادا کی قبریں تھیں، ہم وہاں ابھی تک نہیں پہنچے تھے کہ عزیز اللہ ٹھٹھک کر رک گیا اور سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا، حکیم صاحب رک جائیں، ذرا میری کے درخت تلے دیکھیں، وہاں کوئی ہے۔ میں نے عزیز اللہ کے اشارے پر غور سے دیکھا تو واقعی وہاں بولہ نظر آیا۔ میں نے دل ہی دل میں قرآنی آیتوں کا ورد کرتے ہوئے کہا، ہو سکتا ہے ہماری طرح کوئی اور بھی فاتحہ خوانی کے لیے آیا ہوا ہو، چلو چل کر دیکھتے ہیں۔

عزیز اللہ فوراً رضامند ہو گیا۔ ہم دبے پاؤں آگے بڑھے تو منظر واضح ہو گیا، ایک عورت پیری کے درخت تلے کھڑی نہا رہی تھی، پیری کا درخت چھوٹا، مگر گھنی شاخوں والا تھا، اس لیے اس کے ارد گرد شاخوں نے گھیرا لیا ہوا تھا۔ اس لیے دور سے یہ منظر صاف نظر نہیں آ رہا تھا، پہلے ہم سمجھے کہ یہ کوئی غیر انسانی مخلوق ہے، مگر جب اس کے پاس ہالٹی رہی تو کبھی تو خیال آیا کہ یہ کوئی ضرورت کی ماری کسی جعلی پیر فقیر کے چکر میں آ کر یہ الٹا سیدھا عمل کر رہی ہوگی۔ اپنے شوہر کو غلام بنانے، ساس کو نچا دکھانے، اولاد پیدا کرنے یا پھر غیر شادی شدہ ہونے پر محبوب کو قدموں میں جھکانے کے چکر میں کم عقل عورتیں، عموماً جعلی پیر فقیروں کے جھانسون میں آ جاتی ہیں۔ خیر جاہل عورتوں کو ایک حد تک معاف کیا جا سکتا ہے، مگر پڑھی لکھی اور اچھے گھرانوں کی عورتیں اپنی تقدیر بدلنے یا خواہشات پوری ہو جانے کے لالچ میں ایسے پیر فقیروں کے ہاتھوں کھ پتلیاں بن جایا کرتی ہیں۔ یہ سوچ کر میں نے وہیں کھڑے کھڑے گرج دار آواز میں پوچھا، کون ہے؟

میری آواز پر اس عورت نے خوف زدہ ہو کر چیخ ماری اور جلدی سے پیری کے تنے سے لپٹی چادر کھینچ کر اوڑھ لی اور زمین پر بیٹھ کر زور

پہنچے اور اسے بتایا کہ اس کی بیوی قبرستان میں اولاد کے لیے عمل پڑھ رہی تھی تو شوہر نے سرد مہری سے کہا کہ وہ ایسی عورت کا اعتبار نہیں کر سکتا، جو رات کو گھر سے غائب ہو جائے۔ وہ بانجھ تو تھی، مگر اب بدچلن بھی ہو گئی، لہذا وہ اسے طلاق دیتا ہے، یہ جہاں چاہے چلی جائے۔

اس بد بخت نے اس بد نصیب اور اور مجبور عورت کو دبلیز پر کھڑے کھڑے طلاق دے دی۔ ہم حیران و پریشان کھڑے کے کھڑے رہ گئے، اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ہم لاچار عورت کی مدد کرتے، کیوں کہ کسی حد تک ہم اس معاملے میں بہر حال ملوث ہو گئے تھے۔ ہم اسے اپنے گھر لے آئے۔ اپنی بیوی کو سارا قصہ سنایا، اس نے انسان دوستی کا پورا ثبوت دیا۔ عدت کی مدت پوری ہونے تک وہ ہمارے گھر رہی۔ وہ بے حد سکھ، محنتی اور محبت کرنے والی عورت تھی۔ تم اس زمانے میں بہت چھوٹے تھے، سب بچوں کا دل سے خیال رکھتی تھی، جب اس کی عدت پوری ہو گئی تو عزیز اللہ سے پوچھ کر ہم نے اس کا نکاح اس کے ساتھ کر دیا۔ صورتِ شغل بھی اللہ نے بھولی بھالی اور پیاری عطا کی تھی، رنگ قدرے سانولا تھا، مگر نقش و نگار بہت پرکشش تھے۔ اتفاق کہیں یا اس کی قسمت، عزیز اللہ کا چچا، اس کی شادی کے دو تین ہفتے بعد میرے مطب پر آ گیا۔ اس نے بتایا کہ اس کی فیملی پاکستان جا رہی ہے۔ وہ عزیز اللہ سے آخری بار ملنے آیا ہے۔ میں نے جب عزیز اللہ کو بلا کر اس سے ملوایا تو دونوں چچا بھتیجے لپٹ کر رونے لگے، میں نے اس کی بیوی سے بھی ملوایا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ ان دونوں کو اپنے ساتھ پاکستان لے جائیں، کیوں کہ حالات کا کوئی بھرپور نہیں، ہمیں بھی مطب بند کرنا ہوگا۔

میرے سمجھانے پر چچا کی سوئی ہوئی محبت جاگ اٹھی اور وہ ان دونوں کو اپنے ہم راہ لے گیا۔ اس واقعے کے چند ماہ بعد ہی فسادات پھوٹ گئے، ہم حالات مزید بگڑنے سے پہلے وہاں سے ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے۔ عزیز اللہ کے بارے میں کچھ پتا نہ چل سکا، مگر مجھے کوئی تشویش نہیں تھی، کیوں کہ وہ اپنوں میں چلا گیا تھا اور اسے ایسا ہنر ہاتھ آ گیا تھا، جو اسے رزقِ حلال ہر جگہ دے سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی بیوی بھی نہایت اچھی تھی۔ اس کے گھر کو بہ خوبی سنبھال سکتی تھی۔ آج اتنے برس گزر جانے کے بعد عزیز اللہ اتفاق سے مجھے ملنے آ گیا۔ اپنے کاروبار کے کسی کام کے سلسلے میں حیدر آباد آیا ہوا تھا۔ شہداد پور میں اس کے کسی دوست کا گھر تھا، اس نے سوچا کہ اس سے بھی ملتا چلے، یہاں آ کر اس کا

والد صاحب کی سنائی گئی اس کہانی یا واقعے نے مجھے بہت دیر تک حیران رکھا اور آج بھی اس واقعے پر غور کرتا ہوں تو قدرت کی لکھی گئی تقدیر کی نیرنگیوں پر پیار آنے لگتا ہے۔ عزیز اللہ کی تقدیر میں جو شریک حیات لکھی تھی، وہ اسے کس جگہ اور کن حالات میں ملی اور پھر وہ بانجھ کہلاتے ہوئے بھی بانجھ نہیں رہی، یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں۔ □□

بقیہ: ڈاکری۔ جو چار مہینوں کے بعد پوتا ہے بے وجہ اس کا ساقط کروانا گناہ عظیم ہے۔ ہاں شکمِ مادر میں نطفہ کی وجہ سے اگر ماں کو کوئی ایسا خطرہ لاحق ہو جس سے وہ خود جان سے ہاتھ دھو پڑے یا ایسی پریشانی میں مبتلا ہو جائے جس سے چھٹکارا آسان نہیں تو ایسی صورت میں فقہاء اسلام کا تقریباً اس بات پر اتفاق ہے کہ نطفہ میں جان پڑنے کے باوجود ساقط کرایا جاسکتا ہے۔ البتہ شکمِ مادر میں نطفہ قرار پانے کے بعد جب تک اس میں جان نہ پڑ جائے اس سے قبل حمل کے ساقط کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہی حکمِ زنا کی صورت میں حمل پھینک جانے کا بھی ہے کہ چار ماہ سے قبل اس کا ساقط کروانا منع اور اس سے قبل جائز ہے۔ کیونکہ شکمِ مادر میں قرار پانے والے بچہ کا کوئی تصور نہیں اسلئے اس ساقط کرنا بھی ایک جان کو بلا غرض مارنا ہوگا اور اسلام میں ہر جان کا احترام ایک ہی طرح ہے۔ البتہ زنا بالجبر کی صورت میں اگر عورت حاملہ ہو گئی اور اس کی وجہ سے کسی نفسیاتی پریشانی میں۔ اس حد تک مبتلا ہو جائے کہ وہ خود اپنے آپ کو ہلاک کر لینے پر آمادہ ہو جائے یا اس کے معاشرتی عار کا باعث بنے تو ایسی صورت میں عورت کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ کسی بھی وقت اپنے حمل کو ضائع کر دے خواہ نطفہ میں جان پڑ گئی ہو یا نہیں۔

منظر الاسلام ازہری

تحریک اہل سنت و جماعت

ڈاکٹر اوشا سانیال کی نظر میں

تشکیل کے زیر عنوان ”تحریک اہل سنت و جماعت“ کے امتیازی نشان اور وصف پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ ”اصلاح“ کے نام پر قائم دوسری تحریکوں کے امتیازات اور شخصیات اور خصوصیات کے تقابلی مطالعہ کی روشنی میں ”تحریک اہل سنت و جماعت“ کے مابہ امتیاز کو بتایا گیا ہے۔ ان میں تحریک دیوبند، تحریک اہل حدیث، تبلیغی جماعت، ندوۃ العلماء، قادیانیت اور ہندوؤں کی تحریک قابل ذکر ہیں۔ پھر ہندوستان میں برطانوی استعمار کے رد عمل میں مذہبی قومیت اور مذہبی تشخص کے حوالے سے ”تحریک اہل سنت و جماعت“ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مسجدوں، خانقاہوں اور درگاہوں کے رول پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ اور اس نظر پر کی تعلیل کی گئی ہے کہ مساجد سے وابستہ سرگرمیاں شامل کرنے والی ہوتی تھیں اور مزارات سے وابستہ سرگرمیاں تفریق پیدا کرتی تھیں۔ اس تحریک کے لئے ڈاکٹر سانیال نے ”تحریک اہل سنت و جماعت“ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کی توجیہ پیش کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں کہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک سے وابستہ افراد خود اپنے لئے اس اصطلاح کو استعمال کرتے ہیں اور اس سے تحریک کے لئے نبی (کریم، صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات کی مرکزیت کو سمجھنے میں مدد بھی ملتی ہے۔ نیز یہ بھی کہ اس تحریک سے وابستہ افراد (امام) احمد رضا کو کسی نئے فرقہ کا بانی نہیں بلکہ ایک مجدد مانتے ہیں جنہوں نے لوگوں کو رسول کریم کی سنت اور طریقہ پر واپس لانے کا کام کیا۔ ڈاکٹر صاحبہ نے افتتاحیہ کے آخر میں لکھا ہے کہ ان کی تحقیق نے مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اہل سنت و جماعت کون تھے؟ برطانوی سامراجی فریم ورک اور انیسویں صدی کی دیگر اصلاحی تحریکوں سے ان کا کس طرح کا تعلق تھا؟ ان کا سماجی پس منظر کیا تھا؟ کیا ان کی بنیادیں صرف دیہاتوں میں تھیں جیسا کہ کچھ مورخوں کی تحریروں نے کنفیوژن پیدا کر دیا ہے؟ پھر ان کا اخذ اور مرجع کا ذکر ہے جن سے اس تحقیقی مقالہ کو تیار کرنے میں مدد ملی گئی ہے۔

کتاب کے دوسرے باب میں ”اٹھارہویں اور انیسویں صدی

ڈاکٹر اوشا سانیال ایک ہندوستانی نژاد امریکی اسکالر ہیں۔ ایشیا اور اسلام ان کی تحقیق کا محور ہے۔ Wingate Universtiy میں وہ اسٹنٹ پروفیسر اور Queens University of Charlotte NC, USA میں جزیقی لیکچرر ہیں۔ وہ اپنی کتاب "Devotional Islam and Politics in British India: Ahmad Riza Khan Barelwi and His Movement, 1870-1920. (برطانوی ہند میں عقیدتمندانہ اسلام اور سیاست: احمد رضا خان اور ان کی تحریک 1870-1920) کے لئے علمی حلقوں میں معروف و مشہور ہیں۔ یہ دراصل Columbia University سے ڈاکٹوریٹ آف فلاسفی (Ph.D.) کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے 1990 میں لکھا گیا ایک مقالہ تھا جسے بعد میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔ اب تک اس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب انگریزی زبان میں اسلام اور اہل سنت و جماعت کے مطالعہ کے لئے ایک ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر سانیال نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی حیات اور ان کے افکار پر ایک دوسری کتاب بھی ترتیب دی ہے جس کا نام "Ahmad Riza Khan: In the Path of the Prophet." ہے۔ یہ کتاب آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے 2005 میں چھپ چکی ہے۔ فی الحال وہ ”بریلوی مدارس“ پر تحقیق کر رہی ہیں۔

ڈاکٹر سانیال کی پہلی کتاب کا ایک عمومی جائزہ پیش ہے۔ اس میں انہوں نے برطانوی عہد میں تاریخ، سماج، سیاست اور معاصر ”اصلاحی“ تحریکوں کے تناظر میں ”تحریک اہل سنت و جماعت“ کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔ یہ کتاب، تشکر، ایک افتتاحیہ، نو ابواب، ایک اختتامیہ، ایک نتیجہ، فرہنگ الفاظ، کتابیات اور اشاریہ پر مشتمل ہے۔ افتتاحیہ میں ”انیسویں صدی کے آخر میں اہل سنت اور تشخص کی

ہے۔ ”تحریک اہل سنت و جماعت“ کے فروغ اور استحکام میں ان کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اسی باب میں ”تحریک اہل سنت و جماعت“ کی انجمنوں اور تنظیموں کو بھی نام بہ نام ذکر کیا گیا ہے جن میں کراچی، بریلی اور رامپور میں انجمن اہل سنت، سکندر آباد میں حلقہ اہل سنت، بریلی میں انصار الاسلام اور جماعت رضا مصطفیٰ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ تحریک اہل سنت و جماعت کے فروغ میں مناظروں کی اہمیت کا تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں ”مارہرہ کے برکاتی سادات: انیسویں صدی میں“ کے تحت خانقاہ مارہرہ اور خانوادہ برکاتیہ کی خاندانی تاریخ، مشائخ مارہرہ کے احوال و افکار، تصوف کے میدان میں ان کی تربیتی اور اصلاحی خدمات کا بیان ہے۔ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کے حلقہ ارادت میں داخل ہونے اور بیعت و خلافت سے نوازے جانے کی تفصیلات بھی پیش کی گئی ہیں۔

پانچویں باب میں ”مذہبی استناد کی تفتیش“ کے عنوان سے ”تحریک اہل سنت و جماعت“ اور امام احمد رضا محدث بریلوی علیہ الرحمہ کے نزدیک پیر کی اہمیت اور عظمت پر گفتگو کی گئی ہے۔ حضرت شاہ آل رسول مارہروی اور حضرت نوری میاں علیہم الرحمہ والرضوان سے ان کی عقیدت اور نیاز مندی کی نوعیت کو بیان کیا گیا ہے۔ پھر تفصیل سے بتایا گیا کہ پیر کی ضرورت کب اور کیوں ہوتی ہے اور مرید کے لئے پیر کی رہنمائی کس طرح سے ہوتی ہے۔ لیکن اسی ضمن میں بتایا گیا ہے کہ امام احمد رضا علیہ الرحمہ نے شریعت کو اولیت دی ہے اور طریقت کو اس کا تتمہ قرار دیا ہے۔ اور یہی بات مارہرہ کے پیران عظام کی تعلیمات کی خصوصیات میں سے شمار ہوتی تھی۔ پھر اسی باب میں اعلیٰ حضرت کے پیر ہونے اور ان کے مریدین اور خلفاء کے بارے میں کہا گیا ہے کہ امام احمد رضا کے خلفاء کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ ان میں سے چند کا ذکر ہوا ہے۔ مشائخ مارہرہ اور اعلیٰ حضرت قادریہ سلسلہ سے وابستہ تھے۔ اس لحاظ سے ان کے نزدیک غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمۃ والرضوان کی شخصیت بہت ہی اہم تھی۔ پھر کتاب میں رسول کریم ﷺ کی شفاعت اور غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شفاعت کی نوعیت پر گفتگو ہوئی ہے۔ رسول کریم ﷺ اور غوث اعظم رضی اللہ عنہ کی شان میں لکھے گئے مدحیہ اشعار اور مقبتوں کے نمونے پیش کئے گئے

میں سیاست اور مذہب“ کے زیر عنوان سلطنت مغلیہ کے زوال اور شمالی ہند (یوپی) میں ریاستوں کے قیام اور روہیل کھنڈ، فرخ آباد، رام پور اسٹیٹ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی تاریخ اور مضمرات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر کہا گیا ہے کہ انیسویں صدی کے آخر میں 1857 کے بعد اصلاحی تحریکیں ظاہر ہوئیں۔ ان کے بنیادی مقاصد کیا تھے اور کس طرح سے وہ ایک دوسرے سے مختلف تھیں اس کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ پھر ”تحریک اہل سنت و جماعت“ کو شیخ مجدد الف ثانی، شیخ عبدالحق دہلوی اور شاہ ولی اللہ دہلوی کے افکار اور خیالات کی روشنی میں پرکھا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ سنت اور جماعت سے وابستگی اور تصوف میں اصلاحی رجحانات تحریک اہل سنت و جماعت کی امتیازی خصوصیات تھیں۔ ان رجحانات کی نمائندگی سلاسل اربعہ (قادریہ، نقشبندیہ، چشتیہ اور سہروردیہ) کے کچھ مرکزی کردار کر رہے تھے۔

کتاب کے دوسرے باب میں ”ایک سنی اسکالر: احمد رضا خان بریلوی“ کے زیر عنوان اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کی سوانح پیش کی گئی ہے۔ اس میں ان کی پیدائش، بچپن، تعلیم، اساتذہ، اہم اسفار (مارہرہ کا سفر، سفر حرمین اور وہاں کے علماء سے تعلقات، تبادلہ خیالات اور پنشن کا سفر جس میں علماء نے ان کو مجدد کا خطاب دیا تھا، جبل پور کا سفر) اور ”تحریک اہل سنت و جماعت“ کے لئے ان کی شخصیت پر گفتگو کی گئی ہے۔ کتاب کے تیسرے باب میں ”تحریک اہل سنت و جماعت کی ادارہ جاتی بنیادیں، 1880s-1920s میں“ کے زیر عنوان یہ کہا گیا ہے کہ تحریک اہل سنت و جماعت کے لئے امام احمد رضا کی ذات مرکزی حیثیت کی حامل تھی۔ اس تحریک کے اداروں میں کچھ تو ایسے تھے جن سے علماء وابستہ تھے اور کچھ پیران کرام کی سرپرستی میں چل رہے تھے۔ یہ ادارے شہروں میں بھی تھے اور دیہاتوں میں بھی۔ یہاں اس مغروضہ کی تردید ہوتی ہے کہ ”تحریک اہل سنت و جماعت“ صرف دیہاتوں میں مرکوز تھی۔ پھر ”تحریک اہل سنت و جماعت“ کے اہم مدارس (منظر اسلام بریلی، مظہر اسلام بریلی، مدرسہ عالیہ رامپور، مدرسہ شمس العلوم بدایوں، جامعہ نعیمیہ مراد آباد، دارالعلوم حزب الاحناف اجمورہ وغیرہ) کے قیام اور ان کی کارکردگی کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ طباعتی اور اشاعتی کاموں میں حسنی پریس، مطبع اہل سنت و جماعت اور الرضا جرنل، بریلی، تحفہ حقیقہ، پینہ اور دبہ سکندری، رامپور پر گفتگو کی گئی

اعتراض باتوں کو جو امام احمد رضا کی نظر میں کفریہ تھیں ان کو اس باب میں نقل کر کے ان پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

نویں باب میں ”خلافت، ہجرت اور ترک موالات پر آراء“ کے عنوان سے ”تحریک اہل سنت و جماعت“ کے سیاسی موقف کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ کفار و مشرکین سے موالات اور معاملات رکھنے کے سلسلے میں اعلیٰ حضرت نے جو فتویٰ دیا تھا اس پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ ہندوستان کے دارالاسلام یا دارالحرب ہونے کے سلسلے میں اس دور کے علماء کے خیالات کا تقابلی مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔ اس باب کے تفصیلی مطالعہ سے اس الزام کی قلعی کھل جاتی ہے جو اعلیٰ حضرت پر ان کے مخالفین نے لگایا تھا کہ وہ انگریز نواز تھے۔ ترکوں کی حمایت وہ بھی کرنے کو کہتے تھے۔ مگر خلافت کی شرعی حیثیت کے سلسلے میں ان کے خیالات اس دور کے خلافتیوں سے مختلف تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے دلائل بھی پیش کئے ہیں۔ جہاں تک ترک موالات کی بات ہے تو اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کفار و مشرکین اور اہل کتاب (یہودیوں اور نصرانیوں) سب سے ترک موالات کرنے کو کہتے تھے۔

اختتامیہ میں ”مسئلہ پاکستان پر اہل سنت کا مباحثہ“ کے عنوان سے قیام پاکستان کے سلسلے میں ”تحریک اہل سنت و جماعت“ سے وابستہ تین سرکردہ علماء کے درمیان جو اختلاف رائے تھا اس کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہ حضرات صدر الافاضل نعیم الدین مراد آبادی، شاہ اولاد رسول محمد میاں مارہروی اور برہان الحق جبل پوری تھے۔ ان تینوں کے سوچنی حالات کو بیان کرنے کے بعد ان کے درمیان جو باتیں مشترک تھیں ان کو بیان کیا گیا ہے اور پھر ان کے درمیان اس مسئلے پر جو اختلافات تھے ان کو بیان کیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس کتاب کا افتتاحیہ اور ساتویں، آٹھویں، نویں باب اور اختتامیہ کا مطالعہ ”تحریک اہل سنت و جماعت“ کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ یہ کتاب علمی حلقوں اور دانشوروں میں بہت ہی اہمیت کی حامل ہے۔ کیونکہ انگریزی زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں تاریخی تناظر میں تحریک اہل سنت و جماعت کا تحقیقی مطالعہ کیا گیا ہے۔ آئندہ اب اگر کوئی محقق ہندوستان میں برپا اصلاحی تحریکوں کا جائزہ لے گا تو اس کتاب کو نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

بقیہ صفحہ ۵ پر ملاحظہ فرمائیں

ہیں۔ اور ”تحریک اہل سنت و جماعت“ کے لئے عشق رسول ﷺ کی اہمیت کو اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کی تحریروں سے نمایاں کیا گیا ہے۔

چھٹے باب میں ”احمد رضا کا تصور سنت“ کے عنوان سے ”تحریک اہل سنت و جماعت“ سے وابستہ افراد نے اپنے لئے اس اصطلاح کو کیوں پسند کیا ہے اور سنت سے ان کی مراد کیا ہے ڈاکٹر سانیال نے اس پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اسی باب میں سنت و بدعت اور اجتہاد و تقلید جیسے فقہی اور قانونی اصطلاحوں کے معانی و مفہام بیان کیا گیا ہے۔ ان کی مزید وضاحت کے لئے اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کے فتاویٰ کو نقل کیا گیا ہے۔ جن کی مدد سے یہ دیکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح امام احمد رضا کسی مسئلہ پر قرآن، سنت، اجماع، قیاس اور اقوال ائمہ سے استنباط کرتے تھے۔ ان کے فتاویٰ کی یہ وہ خصوصیت تھی جو ان کے ان معاصر علماء میں نہیں پائی جاتی تھی جو ان سے اختلاف رائے رکھتے تھے۔

ساتویں باب میں ”اہل سنت اور دوسرے مسلمان: انیسویں صدی کے آخر میں“ کے زیر عنوان ”تحریک اہل سنت و جماعت“ اور اہل حدیث، قادیانیوں، شیعہ اور دیوبندیوں کے ساتھ جو فکری اور نظریاتی اختلافات تھے ان کی نوعیت کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اسی باب میں ضروریات دین اور فاسد عقائد پر گفتگو کے ضمن میں حسام الحرمین کا سیر حاصل مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ علمائے حرمین کی تائیدات کو اعلیٰ حضرت کی اہم کامیابی قرار دیا گیا ہے۔ تکفیر کے سلسلے میں اعلیٰ حضرت کے موقف کا بیان ہے۔ پھر الگ الگ فرقوں اور تحریکوں اور ”تحریک اہل سنت و جماعت“ کے درمیان جن مسائل پر اختلافات تھے ان کو بیان کیا گیا ہے۔ تحریک ندوہ کی مخالفت کے اسباب اور وجوہات اور اس مسئلہ پر اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کی حمایت کرنے والے علمائے کرام کے ناموں کو بھی کتاب کے اسی باب میں بیان کیا گیا ہے۔

آٹھویں باب میں ”دیوبندیوں اور وہابیوں کے سلسلے میں اہل سنت کا موقف“ کے تحت اہل دیوبند اور اہل حدیث کے درمیان مماثلت اور اختلافات کی نوعیت پر گفتگو کرتے ہوئے یہ کہا گیا کہ اہل حدیث تقلید کی مخالفت کرتے تھے جبکہ اہل دیوبند خفی فقہ کے مقلد تھے۔ تاہم تحریک اہل سنت و جماعت کی نظر میں ان کے درمیان مماثلت بھی تھی۔ اسی لئے وہ ان دونوں کے لئے ”وہابی“ کی اصطلاح کو استعمال کرتے ہیں۔ حسام الحرمین کے حوالے سے ان کے سرکردہ علماء کی قابل

ڈائری

”حاصل مطالعہ“ کی جگہ ایک نئے کالم ”ڈائری“ کا آغاز ہوا ہے جو آئندہ تسلسل سے جاری رہے گا۔ امید کہ قارئین اس نئی طرح کو پسند فرمائیں گے اور اپنی آرا سے نوازیں گے۔ (ادارہ)

ہوتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا لقب ”رحمت اللعالمین“ ہے، قرآن شریف میں ہے: ہم نے آپ کو سارے جہاں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔ امن و امان کا تصور صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ دنیا کے تمام انسان کے لئے ہے خواہ اس کا تعلق اسلام سے ہو یا نہ ہو۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا۔ ایک دوسری جگہ فرمایا: رحم کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ رحم فرماتا ہے۔

رحم و کرم کا یہ سلسلہ انسانوں تک ہی محدود نہیں بلکہ جانوروں، چوپایوں اور بے جان نباتات کو بھی شامل ہے، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جانوروں پر بہت زیادہ بوجھ نہ لا دو، اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو تمہارے لئے صرف اس لئے مسخر کیا ہے تاکہ تم آسانی سے اپنی منزل تک پہنچ سکو، لہذا ان سے ضرورت کی حد تک ہی کام لو۔

اسلام نے جانوروں کے ساتھ صرف اچھا سلوک کرنے کی ہی تلقین نہیں کی بلکہ ان کے ساتھ اچھا معاملہ کرنے والوں کو اجر و ثواب کی خوشخبری بھی دی۔ ایک حدیث میں ہے: ایک شخص کہیں جا رہا تھا، اسے پیاس کی شدت کا احساس ہوا، اسے ایک کنواں نظر آیا، اس نے پانی پی کر اپنی پیاس بجھائی، اچانک اس کی نظر ایک کتا پر پڑی جو پیاس کی شدت سے مٹی چاٹ رہا تھا، اس نے سوچا یہ کتا بھی میری ہی طرح پیاسا معلوم ہوتا ہے، کنواں سے پانی نکالنے کا کوئی سامان اس کے پاس موجود نہیں تھا، وہ کنواں میں اترا اور پے موزہ میں پانی بھر لیا، دانت سے پکڑ کر باہر آیا اور کتا کو پانی پلایا، اللہ تعالیٰ نے اس کے عوض اس کے گناہوں کی مغفرت فرمادی۔ صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ جانوروں کے ساتھ اگر ہم اچھا معاملہ کریں گے تو کیا ہمیں اس کا کچھ اجر ملے گا؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ہر جاندار کے ساتھ بھلائی کے عوض اجر ملتا ہے۔

اس مختصری جہید کے بعد ہر ایک سوال کا جواب بالترتیب ملاحظہ کیجیے:

۱۲۔ نومبر ۲۰۰۷ء کو نارٹھ کیرولینا (امریکہ) کی ویک فورسٹ یونیورسٹی کی دعوت پر ایک علمی اور فکری مذاکرہ میں شریک ہوا۔ مذاکرہ میں میرے علاوہ یہودی، عیسائی اور بدھ مذہب کے نمائندہ بھی موجود تھے۔ مذاکرہ کا عنوان ”سیاسی معاملہ میں مذہبی نظریہ“ تھا، اس عنوان کے تحت کچھ مخفی سوالات بھی دیئے گئے تھے اور کچھ سامعین کی طرف سے فوری سوالات ہر مذہب کے نمائندہ سے کئے گئے۔ سوال یہ ہیں:

- ۱۔ اسلام میں جنگ کی اجازت کس حد تک ہے؟
- ۲۔ جنگوں میں ایٹمی اور کیمیائی اسلحہ کا استعمال کیسا ہے؟
- ۳۔ غیر مسلم ملکوں سے تعلق کے بارے میں اسلام کا موقف کیا ہے؟
- ۴۔ سیاسی معاملہ میں مذہب کا کیا رول ہونا چاہئے؟
- ۵۔ آپ کے خیال میں امریکہ کا سیکولر نظام بہتر ہے یا یورپ کا؟ بلطف دیگر جس طرح یورپ میں ”حجاب“ میں ملبوس عورتوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے ایسا ہی امریکہ میں بھی ہونا چاہئے یا امریکہ کو اپنی موجودہ حکمت عملی پر برقرار رہنا چاہئے؟
- ۶۔ انسان کی تخلیق اور اس کے وجود سے متعلق اسلام کا نظریہ کیا ہے؟
- ۷۔ عام خیال یہ ہے کہ ”اسقاط حمل“ اسلام میں منع ہے۔ کیا اس پر مطلقاً پابندی ہے حتیٰ کہ عورت کے ساتھ جنسی زیادتی کی صورت میں بھی اجازت نہیں یا اس میں کچھ تفصیل ہے؟

جواب سے پہلے میں نے مختصری جہید اس طرح پیش کی: اسلام امن و امان، رحمت و رافت اور پیار و محبت کا مذہب ہے۔ ظلم و عدوان، فساد و فتنہ سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ اس نے ہر جگہ یہی تلقین کی ہے کہ کسی بھی معاملہ کو پیار و محبت سے حل کیا جائے۔ لفظ ”اسلام“ کا مطلب ہی امن و سلامتی ہے۔ اسی طرح ”رحمن“ اور ”رحیم“ اللہ تعالیٰ کے ناموں سے ہے جس کی دلالت بھی امن و امان اور رحمت و رافت پر

بکریوں اور اونٹوں کو بلا ضرورت ذبح نہیں کرنا، ایسی قوم سے ملو گے جنہوں نے اپنے آپ کو گر جا گھروں میں بند کر رکھا ہوگا انہیں اسلام کی دعوت دینا اور پھیٹر چھاڑنا نہ کرنا۔ یہی طریقہ حضرت عمر کا بھی تھا۔ اس تفصیل کی روشنی میں یہ بات واضح ہو گئی کہ جب اسلام حالت جنگ میں معصوم لوگوں کے جانوں کی اس قدر حفاظت کرتا ہے تو پھر جنگوں میں ایسے اسلحہ کا استعمال جس سے بلا تفریق فوجی غیر فوجی، بچے، بوڑھے، عورتیں اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں کیسے درست ہو سکتا ہے؟ خاص طور پر آج کل استعمال ہونے والا کیمیاوی اسلحہ جس سے روئے زمین پر موجود معصوم جانیں ہی ضائع نہیں ہوتیں بلکہ آنے والی کئی نسلیں بھی اپنا بچ اور گونا گوار بہرہ پیدا ہوتی ہیں، حیوانات و نباتات کی جانوں کا ڈھیر لگ جاتا ہے اس لئے اسلامی نظریہ سے ایسی یا کیمیاوی اسلحہ کا استعمال درست نہیں۔

۳۔ انسانیت کی تکریم اسلام کی بنیادی تعلیم ہے۔ انسان بہ حیثیت انسان ایک ہے، رنگ و نسل، ملک و ملت کی علیحدگی سے انسانیت کی تکریم میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اے لوگو! ہم نے تمہیں مرد و عورت بنایا، قبیلہ اور گروہوں میں تقسیم کر دیا، تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو، تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو متقی اور پرہیز گار ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے، رنگ و نسل کی وجہ سے کسی کو کسی پر کوئی امتیاز حاصل نہیں۔ اس ضمن میں اسلام نے آپسی میل جول اور تعلقات سے منع نہیں کیا، یہ تعلق افراد کا افراد سے ہو یا ایک ملک کا دوسرے ملک سے ہو۔ کسی بھی ملک کے ایک مسلمان کو دوسرے ملک کے کسی بھی غیر مسلم سے تعلق کی پوری آزادی ہے، یونہی ایک اسلامی ملک کو دوسرے غیر اسلامی ملک سے انسانی، تجارتی اور آپسی تعاون کا پورا حق حاصل ہے، اس ضمن میں اسلامی ملک پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ غیر اسلامی ملک سے کئے گئے معاہدہ کی پوری پاسداری بھی کرے، معاہدہ کی خلاف ورزی بہت بڑا جرم ہے۔ اسلام میں ملک کا غیر اسلامی ملک سے تعلق کے بارے میں قرآن کا فرمان ہے: اگر وہ (غیر مسلم) امن و امان چاہتے ہوں تو ان کے ساتھ امن و امان کا رشتہ قائم کرو اور اللہ پر بھروسہ کرو۔

یونہی اگر کوئی غیر مسلم اسلامی ملک میں ہو تو اسلامی حکمرانوں پر اس کی حفاظت، خطر داری ضروری ہے کیونکہ وہ کئے گئے معاہدہ کے تحت

۱۔ دنیا کے دوسرے اقوام کی طرح اسلام میں بھی جنگ کا تصور موجود ہے، مگر وہ زبردستی جنگ پر نہیں ابھارتا، اگر کسی ملک یا قوم کی طرف سے اگر اسے خطرہ لاحق ہو یا دشمن اس پر حملہ آور ہو جائیں تو اس وقت پھر دفاعی جنگ کی کھلی اجازت ہے، قرآن کریم میں جہاں کہیں بھی دوسرے مذاہب کے لوگوں سے قتال کرنے پر زور دیا گیا ہے ان سب کا تاریخی پس منظر یہی ہے کہ وہ تو میں مسلمانوں کے لئے خطرہ بنی ہوئی تھیں، ان کی تہدیدات کی وجہ سے مسلمانوں کا امن و امان غارت ہو رہا تھا، لہذا قرآن کریم نے ان سے جنگ کی اجازت دی، ان آیتوں کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مسلمان زبردستی کسی قوم سے نبرد آزما ہو جائے۔ اسلام کے ابتدائی ایام اس بات کی بین دلیل ہے، مسلمانوں نے مکہ میں تیرہ سال گزارا، قریش نے ان پر ہر طرح کے ظلم کو جائز رکھا، حتیٰ کہ انہیں مکہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا، جب وہ مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے گئے تو قریش کی طرف سے مسلسل دھمکیاں موصول ہوتی رہیں، جب صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تب کہیں جا کر اللہ تعالیٰ نے ان سے جنگ لڑنے کی اجازت دی۔ جب مکہ فتح ہوا تو اسلام نے وہاں بھی تاریخ قائم کی، سارے وہ لوگ جو اسلام کے ازلی دشمن تھے، نبی اکرم ﷺ نے ان سب کو کہا: جاؤ تم سب آزاد ہو۔ جنگ سے اسلام کا مقصد صرف مسلمانوں کو امان بخشنا نہیں تھا بلکہ دیگر مذاہب کے لوگوں کو بھی امن و امان اور ان کے عبادت گاہوں کی حفاظت بھی مقصود تھی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اگر اللہ بعض کو بعض سے نہ روکتا تو خانقاہیں، گرجا گھر اور کلیسے جن میں کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر ہوتا ہے تباہ و برباد کر دی جاتیں ۲۲/۴۱۔

۲۔ اسلام نے جنگ کی حالت میں بھی انسانیت کا پورا لحاظ کیا ہے، ایسے انہیں ہے کہ فوجیوں کو آنکھیں موند کر دشمن کے مقابلہ میں کود جانے کو کہا ہے۔ کسی بھی جنگ میں جانے سے پہلے نبی اکرم ﷺ فوج کے سربراہ کو خاص طور پر تعلیم دیتے تھے کہ بوڑھوں کو قتل نہ کرنا، بچوں اور عورتوں پر بھی تلواریں نہ اٹھانا۔ خلفاء راشدین کا بھی طریقہ بعد میں یہی رہا کہ جب فوج کو کہیں جنگ کے لئے بھیجتے تو ان باتوں کی خاص طور پر نصیحت کرتے، حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک فوجی قائد کو وصیت کی: خیانت، بد عہدی، بے وفائی نہیں کرنا۔ دشمنوں کا مثلہ نہ بنانا۔ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا۔ کھجور کے درختوں کو برباد مت کرنا اور نہ ہی اسے جلاتا، پھل دار درختوں کو مت کاٹنا۔ گائے

ہی نسل انسانی کی ابتدا ہوئی۔ مٹی کے سات مرحلوں سے گزرنے کے بعد انسان اول یعنی آدم علیہ السلام کا ڈھانچہ تیار ہوا۔ پہلے مرحلہ کے بارے میں قرآن نے فرمایا: عیسیٰ کی پیدائش کا مثال اللہ کے نزدیک آدم کے پیدائش کی طرح ہے، جس طرح اللہ نے انہیں مٹی سے پیدا کیا، کہا ”ہو جا“ تو وہ ہو گیا۔ (العمران: ۵۹)

دوسرا مرحلہ: یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتے سے کہا میں کچھ کا ایک انسان بنانے والا ہوں (بقرہ: ۷۱)

تیسرا مرحلہ: ان سے پوچھو ان کی پیدائش زیادہ مضبوط ہے یا ہماری، بیشک ہم نے ان کو چمکتی مٹی سے بنایا (۱۱۳/۷۱)

چوتھا مرحلہ: یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتے سے کہا میں انسان بچتی مٹی سے جو بد بودار سیاہ گارے سے بنانے والا ہوں (۲۸/۱۵) پانچواں مرحلہ: اس نے انسان کو ٹھیکری کی طرح بچتی مٹی سے بنایا (۱۲/۵۵)

چھٹا مرحلہ: قرآن کریم کی اسی مذکورہ آیت سے چھٹا مرحلہ بھی معلوم ہوتا ہے یعنی ایسی مٹی سے پیدائش جو ٹھیکری کے قریب ہو۔

ساتواں مرحلہ: جب میں اسے ٹھیک کر لوں اور اس میں اپنی طرف کی خاص معزز روح پھونک دوں تو اس کے لئے مسجد میں گر پڑنا (۲۹/۱۵)

انسان کی تخلیق یہ سات مراحل ہیں، چھ میں مٹی کا عنصر موجود ہے اور ساتوں روح کا مرحلہ ہے۔ انسانی تخلیق سے متعلق اسلام کا یہی نظریہ ہے۔

۷۔ اسلام نے جہاں ایک طرف انسان کو معزز بنایا وہیں دوسری طرف اس کے جان کی اہمیت پر بھی زور دیا حتیٰ کہ اگر کسی نے بغیر وجہ دوسرے کی جان لے لی تو اسے پوری انسانیت کا قتل قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر لکھ دیا کہ جس نے بغیر جان کے بدلے کسی جان کی قتل کی یا زمین میں فساد پھیلایا تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کیا اور جس نے ایک جان کو جلایا گویا اس نے سب لوگوں کو جلایا۔ (۳۲/۵)

اللہ کے رسول محمد ﷺ نے تو کسی پریشانی کی وجہ سے موت کی آرزو تک کرنے کو منع فرمایا ہے۔ اس میں کوئی فرق نہیں کہ انسان بچہ ہو یا بوڑھا بے عوض قتل کرنا ہر حال میں منع ہوگا۔ اس لئے اسقاط حمل سے متعلق بھی اسلام کا یہی نظریہ ہے کہ جب نطفہ کے اندر جان پڑ جائے

بقیہ صفحہ ۵۲/۵۲ ملاحظہ فرمائیں

ہوگا، اسے شخصی اور مذہبی ہر طرح کی آزادی ملے گی، وہ اپنی تہذیب کے مطابق جس طرح چاہیں زندگی گزارنے کے مجاز ہوں گے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جس نے کسی معاہدہ (غیر مسلم) کو تکلیف دی میں قیامت کے دن اس کا خصم ہوں گا۔ اسی طرح اگر کوئی غیر اسلامی ملک مسلمانوں کو حقوق کی آزادی دیتا ہے، تو مسلمان وہاں اپنی زندگی گزار سکتے ہیں، نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کو حبشہ جا کر کچھ دن گزارنے کے لئے اس لئے کہا تھا کہ وہاں کی عیسائی حکومت مسلمانوں کے لئے نرم گوشہ رکھتی تھی، اس لئے مختلف تہذیب و ثقافت کے لوگوں کے ساتھ بھائی چارہ اور دوستی کے ساتھ رہنے میں اسلام کوئی مضائقہ نہیں۔

۴۔ اسلام میں دین اور سیاست کی کوئی تفریق نہیں۔ لہذا مذہبی اور سیاسی رہنما میں بھی کوئی فرق نہیں، عدل و انصاف اور صدق و سچائی پر استوار کی گئی سیاست ہی مذہب ہے، نبی اکرم ﷺ بیک وقت ایک دینی قائد ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی بد رہ بھی تھے، یہی حال خلفاء

راشدین کا بھی تھا، وہ سب جہاں ایک طرف مذہبی رہنما تھے دوسری طرف عظیم سیاسی قائد بھی تھے، بلکہ اسلامی اعتبار سے مذہبی رہنما کو ہی سیاست کا بار بھی اٹھانا چاہئے، کیونکہ وہ تمام اصول اور ضابطہ اخلاق سے آشنا ہوگا تو حکومت کا دیا ننداری کے ساتھ نبھا بھی سکے گا۔

۵۔ میرا خیال ہے کہ امریکی حکومت کا موجودہ سیکولر نظام یورپ کے نظام سے بہتر ہے اور اسی نظام پر اسے قائم بھی رہنا چاہئے، یہاں ہر مذہب کے ماننے والوں کو اپنے طریقہ سے زندگی گزارنے کا حق ہے، اس سے جہاں ایک طرف تمام مذہب کے ماننے والوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہوگی وہیں امن و امان، پیار و محبت کی فضا بھی عام ہو سکے گی، اسلام نے ایسے ماحول کی ہمیشہ قدر کی ہے۔

۶۔ اسلام میں تخلیق انسانی کا نظریہ کسی مخلوق سے واسطہ نہیں۔ اس کا ماننا ہے کہ انسانی تخلیق کا سبب ایک لافانی وجود ہے جس کے ابتداء کی کوئی حد ہے نہ انتہائی۔ وہ ازلی اور ابدی ہے۔ اس نے ہی دنیا کی تخلیق کی اور انسانیت بھی اسی کے دم سے وجود میں آئی۔ ان تمام وجود بالخصوص انسان کی تخلیق کا رشتہ اس کے امر ”کن“ سے ملتا ہے۔ وہ جب بھی کسی چیز کو پیدا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو حکم دیتا ہے ”ہو جا“ تو وہ چیز پیدا ہو جاتی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام روئے زمین پر سب سے پہلے انسان ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مٹی کے ذریعہ پیدا فرمایا، ان سے

نام کتاب: قرآن کریم کی سائنسی تفسیر: ایک تنقیدی مطالعہ

مولف: مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری، ضخامت: ۶۳۰ صفحات، قیمت: ندارد، سال اشاعت: ۱۴۲۹ھ/۲۰۰۸ء

ناشر: تاج النحل اکیڈمی، بدایوں تقسیم کار: مکتبہ جام نور، ۴۲۲ میاں محل، جامع مسجد، دہلی-۶

بات اس وقت کی ہے جب میں جامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں زیر تعلیم تھا، استاذ گرامی حضرت علامہ محمد احمد مصباحی کے کمرے میں پہلی بار بدایوں سے شائع ہونے والا ماہنامہ مجلہ مظہر حق کا ایک شمارہ زیب نگاہ بنا، مدیر مفتی عبدالکیم نوری تھے جن کی شخصیت میرے لیے مانوس و معلوم تھی، میں پرچہ الٹ پلٹ کر دیکھا تو ایک عنوان پر نظر ٹک گئی، میں نے جلدی جلدی اس کے مندرجات پر ایک سرسری نظر دوڑائی، مضمون بہت پسند آیا، یہ سلسلہ وار مقالے کی ایک قسط تھی، جی میں آیا کہ کاش میں پورے مقالے کو پڑھ سکتا، لیکن یہ میرے لیے ممکن نہ ہو سکا، اب یہ مقالہ کتابی شکل میں میرے سامنے ہے جس کے مولف ہیں میرے بزرگ دوست صاحب زادہ مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری بدایونی، جن سے شناسائی کی پہلی وجہ بھی یہی علمی مقالہ بنا۔ اواخر ۲۰۰۴ء میں دہلی چلا آیا اور آتے ہی مدیر اعلیٰ جام نور مولانا خوشتر نورانی کی رفاقت میں تحریک جام نور کو آگے بڑھانے میں مصروف ہو گیا، میں نورانی صاحب سے بار بار اصرار کرتا رہا کہ آپ مولانا اسید الحق سے کہیں کہ وہ اپنا علمی مقالہ پھر سے جام نور میں شائع کرائیں، موصوف کے کہنے پر بالآخر مولانا اسید الحق نے اپنے مقالے پر نظر ثانی کی اور بعض حذف و اضافات کے بعد جام نور کو ارسال کیا، جو اگست ۲۰۰۶ء تا نومبر ۲۰۰۶ء کے شماروں میں قسط وار شائع ہوا۔ جام نور کا جو ہم نے معیار متعین کیا ہے اس کے پیش نظر ہمیں بہت سارے غیر مطبوعہ مضامین بھی شائع کرنے سے معذرت کرنی پڑتی ہے جس کے لیے ہمارے بعض کرم فرمانا راض بھی ہو جاتے ہیں، لیکن یہ مطبوعہ مقالہ تھا جسے نہ صرف ہم نے شائع کیا بلکہ اس کے لیے مقالہ نگار سے گزارش کی اور اصرار کیا۔

کتاب کے ”پیش لفظ“ میں مولف محترم نے جو معلومات فراہم کی ہے اس سے اس مقالے کی مزید اہمیت و مقبولیت معلوم ہوئی، ”پیش لفظ“ کے مطابق یہ مقالہ موصوف نے ازہر شریف میں دوران طالب علمی عربی زبان میں ”التفسیر العلمی للقرآن دراسة نقدیہ“ کے عنوان سے لکھا تھا، بعد میں اسے اردو میں منتقل کر کے ۲۰۰۳ء میں کتاب کے ”پیش لفظ“ میں مولف محترم نے جو معلومات فراہم کی ہے اس سے اس مقالے کی مزید اہمیت و مقبولیت معلوم ہوئی، ”پیش لفظ“ کے مطابق یہ مقالہ موصوف نے ازہر شریف میں دوران طالب علمی عربی زبان میں ”التفسیر العلمی للقرآن دراسة نقدیہ“ کے عنوان سے لکھا تھا، بعد میں اسے اردو میں منتقل کر کے ۲۰۰۳ء میں

(۱) قرآن کے سائنسی اعجاز کو خارج از امکان بنانا ایسے ہی غلط ہے جیسے اس کے مظاہر اعجاز کو صرف سائنسی اعجاز میں منحصر ماننا۔

(۲) ایک نص قرآنی مختلف معانی کا محتمل ہو سکتا ہے، لیکن ان معانی میں اختلاف تنوع ہونا چاہیے نہ کہ اختلاف تضاد۔

(۳) یہ صحیح ہے کہ قرآن کتاب ہدایت ہے، سائنس یا ہندسہ کی کتاب نہیں، لیکن اگر کوئی حقیقت علمیہ اور نظریہ کونیہ بلا تکلف و تحکم کسی

آیت پر مطبق ہو تو اس سے منہ موڑ لینے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔

(۳) قرآن اس سے بے نیاز ہے کہ اس کی صداقت و صحت پر علوم جدیدہ سے سند اور دلیل لائی جائے، البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس سے اسلام کی دعوت و تبلیغ میں مدد ملی جاسکتی ہے۔

(۵) سائنسی تفسیر کے مخالفین کہتے ہیں کہ سائنسی نظریات و تحقیقات کے اندر خود ہی ثبات نہیں ہے، ایسے میں قرآن و سائنس میں مطابقت کی تلاش قرآن کو کتاب تضاد بنا کر پیش کرنا ہے، ڈاکٹر جمال مصطفیٰ پروفیسر شعبہ تفسیر جامعہ ازہر جواب میں کہتے ہیں کہ ”اگر کسی حقیقت علمیہ ثابتہ کی نظیر کسی آیت کے محتمل معانی میں سے کسی ایک میں پائی جائے تو اس احتمال کو تسلیم کیا جائے گا، مگر اس پر جزم و قطعیت کا حکم نہیں لگایا جاسکتا، اب اگر کسی زمانے میں بالفرض اس نظریے کے خلاف دلیل قائم ہو جائے تو بھی قرآن پر کوئی حرف نہیں آئے گا، کیوں کہ ہم نے اس حقیقت علمیہ پر نص قطعی کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔“ پروفیسر صاحب کا جواب بظاہر معقول ہے مگر ”فیہ مافیہ“۔ (ص: ۲۰)

ان نکات پر غور کرنے سے جو بات سب سے پہلے واضح ہو کر آتی ہے وہ یہ کہ مولانا اسید الحق قادری بھی سائنسی تفسیر کے حامیوں میں سے ہیں، یہ اور بات ہے کہ وہ اس کے لیے تکلف و تحکم اور کھینچ تان کے قائل نہیں، سائنسی تفسیر لکھتے وقت ان کے نزدیک یہ بھی ضروری ہے کہ کوئی ایسی نئی بات نہ کہہ دی جائے جو کسی پرانی تفسیر، جو امت کا عقیدہ یا معمول ہو، کے خلاف ہو، یا وہ ایسی بات ہو جس کا رد قرآن کی کوئی دوسری آیت کر رہی ہو۔ بڑے ادب کے ساتھ یہاں میں چوتھے نکتے کے پہلے حصے کے بارے میں یہ کہنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ یہ سائنسی تفسیر کے مخالفین کا ”خطیبانہ جملہ“ ہے، اور خطیبانہ جملہ صرف کانوں کو بھلے معلوم ہوتے ہیں، اگر اس طرح کے جملوں سے سائنسی تفسیر کا رد کرنا ممکن ہو تو کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ ”قرآن اس سے بے نیاز ہے کہ اس کی صداقت و صحت پر علوم بلاغت سے صحت و سند لائی جائے۔“ اور یہ کہہ کر وہ قرآن کی ماضی میں لکھی گئی بلاغی تفسیروں کو رد کر سکتا ہے جن کا کردار اعجاز قرآن کے اظہار میں بہت نمایاں تسلیم کیا گیا ہے۔ یہاں سوال یہ نہیں ہے کہ قرآن سائنسی تفسیر کا محتاج ہے یا نہیں، سوال یہ ہے کہ آیا مسلم علماء کو اس بات کی ضرورت ہے یا نہیں کہ وہ سائنسی تفسیر کریں تاکہ دین اور قرآن کے تعلق سے مشکوک ذہنوں کے شبہات کا ازالہ ہو اور انہیں یقین یا حق یقین کی دولت ملے؟

عالی مرتبت مولانا اسید الحق نے مخالفین کی اس بات کو ”درست“ قرار دیا ہے، اس کے بعد خود ہی یہ سوال قائم کیا ہے کہ ”اگر سائنسی تفسیر نہ کی جائے تو آخر ”خوگر پیکر محسوس“ اور دلیل و مشاہدہ کے عادی عقلیت پسند اور مادہ پرست انسان کو کیوں کر قرآن کی صداقت کا قائل کیا جاسکتا ہے؟“ پھر خود ہی اس کا جواب دیا ہے، جواب کا حاصل یہ ہے کہ یورپ و امریکہ میں جن لوگوں نے گزشتہ برسوں میں اسلام قبول کیا ہے ان میں ایک تعداد ان کی بھی ہے جو سائنسی تفاسیر سے متاثر ہو کر اسلام کی طرف مائل ہوئے لیکن اکثریت ان کی ہے جو اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر دامن اسلام سے وابستہ ہوئے۔ موصوف نے اپنی اس بات کی تائید میں ڈاکٹر احمد المرسی کی کتاب ”لماذا انا مسلم؟“ کا حوالہ دیا ہے جس میں ۱۰۰ غیر مسلموں کی داستان ایمان افروز ہے، موصوف لکھتے ہیں کہ ان میں ”صرف ۱۹ راولگ ایسے ہیں جو قرآن اور سائنس کی حیرت انگیز تطبیق دیکھ کر متاثر ہوئے، باقی سب لوگوں کو قرآن کی انہیں تعلیمات نے متاثر کیا ہے جن کا ہم نے ماقبل میں ذکر کیا ہے“ (ص: ۲۸) خیال رہے کہ موصوف یہ بات سائنسی تفسیر کے مخالفین کی تائید اور سائنسی تفسیر کی عدم ضرورت کے اثبات میں لکھ رہے ہیں، لیکن کوئی غور کر کے بتائے کہ اس بات سے سائنسی تفسیر کی عدم ضرورت ثابت ہو رہی ہے یا ضرورت؟ موصوف کی بات مان لینے کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ آج اسلام کی ۱۹ فی صد تبلیغ صرف سائنسی تفسیر کی رہیں منت ہے (مسلم اور غیر مسلم ذہنوں کے دین کے تعلق سے شبہات کا ازالہ الگ) کیا اس سے سائنسی تفسیر کی شدید ضرورت ثابت نہیں ہوتی؟

موصوف نے پانچویں نکتہ کے ذیل میں پہلے مخالفین کا ایک اعتراض نقل کیا جسے ”نہایت برجستہ اور منطقی“ بتایا (ص: ۳۹) جس کے جواب میں اپنے استاذ ڈاکٹر جمال مصطفیٰ کا اقتباس پورے ایک صفحے میں نقل کیا جو مجھے ”نہایت برجستہ اور منطقی“ معلوم ہوا (اس میں میرے فہم کا قصور بھی ہو سکتا ہے) پھر اس کو ”بظاہر معقول مگر فیہ مافیہ“ (ص: ۲۰) کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ اب یہ کم علم یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہے کہ یہ نکتہ نہ رہا ”معمہ“ بن گیا۔ نیز اس ”فیہ مافیہ“ کو اگر اجاگر کر دیا گیا ہو تو مجھ جیسے کم علموں کی رہنمائی ہو جاتی، پھر یہ سوال بھی مولانا اسید الحق پر قرض رہتا ہے کہ اگر وہ سائنسی تفسیر کے حامیوں میں ہیں تو مخالفین کے اس اعتراض کا معقول اور صحیح جواب کیا ہے جو ”فیہ مافیہ“ کے نقص سے بری ہے؟

بقیہ: صفحہ ۲۹ پر ملاحظہ فرمائیں

دینی، ملی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں

گلبرگہ شریف کرناٹک میں امام احمد رضا سمینار کا نفرنس

مزار پر انوار خواجه دکن حضرت بندہ نواز گیسو دراز علیہ الرحمہ کی بابرکت چھاؤں میں رضا اکیڈمی گلبرگہ برسوں سے تعلیمات اولیاء کرام کی ترویج و اشاعت میں مصروف کار ہے۔ اس سال رضا اکیڈمی نے ۲۴ فروری ۲۰۰۸ء کو ایک تاریخی پروگرام کا انعقاد کیا۔ دن میں علمی و ادبی مذاکرہ تھا، جس کا عنوان 'امام احمد رضا علمی و ادبی سمینار' دیا گیا تھا۔ رات میں جلسہ عام تھا، جس کا عنوان 'امام احمد رضا: عالم اسلام کی علمی و عبقری شخصیت' تھا۔ دونوں پروگرام کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

امام احمد رضا علمی و ادبی سمینار: باحاطہ فاران ہائی اسکول درگاہ روڈ، یہ سمینار صبح ۱۰ بجے سے شروع ہو کر شام ۵:۳۰ بجے تک جاری رہا اور دوپہر میں نماز ظہر و طعام ماحضر کا وقفہ رہا۔ دہلی سے تشریف لائے معروف عالم دین مولانا سلیم اختر صاحب مصباحی نے صدارت فرمائی۔ نظامت کا فریضہ قاضی محمد شکیل الدین ریسرچ اسکالر گلبرگہ یونیورسٹی نے انجام دیا، جب کہ مہمان خصوصی محترم جناب عبدالوہاب عندلیب صاحب ڈائریکٹر آف اسٹڈیز خولہ ایجوکیشن سوسائٹی گلبرگہ اور محترم جناب محمد سعید نوری بانی رضا اکیڈمی ممبئی تھے۔

نشست اول کے مقالہ نگار اور ان کے موضوعات یہ تھے:

پروفیسر محمد مصطفیٰ شریف، صدر شعبہ عربی عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

'امام احمد رضا اور علم حدیث'

ڈاکٹر حافظ محمد اعظم رضا، رکن رضا اکیڈمی شولا

'امام احمد رضا اور ہندوستانی سماج'

پروفیسر ڈاکٹر عبدالحمید اکبر، صدر شعبہ اردو و فارسی، گلبرگہ یونیورسٹی

'امام احمد رضا کی شاعری کا تبلیغاتی نظام'

شیخ محمد افضل الدین جنیدی، ریسرچ اسکالر گلبرگہ یونیورسٹی

'امام احمد رضا کی شاعری میں تصوف کی وضو نشانیاں'

نشست دوم کے قلم کار اور ان کے عنوانات یہ ہیں:

مولانا مفتی محمد حسن الدین - کامل نظامیہ حیدرآباد

'امام احمد رضا کی فقیہانہ بصیرت'

ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی، بانی پورنیہ، بہار

'امام احمد رضا اور عالمی جامعات'

سید خولہ معز اشرفی، ادارہ تحقیقات علمیہ، حیدرآباد

'امام احمد رضا اور احترام سادات'

ڈاکٹر منظور احمد دکنی، پروفیسر شعبہ اردو، گلبرگہ یونیورسٹی

'کلام رضا میں فنی لوازم کی جلوہ گری'

پروفیسر عبدالحمید اکبر اور دیگر شرکاء و سامعین نے ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی کے مقالہ کو حاصل سمینار قرار دیا اور انہیں توصیفی سند سے نوازا، ان شاء اللہ مولیٰ یہ سارے مقالے عنقریب کتابی صورت میں شائع ہوں گے۔ رات کا پروگرام جلسہ عام 'امام احمد رضا کی علمی و عبقری شخصیت' کے عنوان سے تھا۔ مقامی علماء و شعراء کے علاوہ جس کے مقررین خصوصی پروفیسر ڈاکٹر مصطفیٰ شریف حیدرآباد، ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی ممبئی اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ نجم القادری ممبئی تھے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ شریف نے مذہبی اقدار اور امام احمد رضا، ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی نے 'اسلامی عقائد و نظریات کے تحفظ میں امام احمد رضا کا کردار' اور ڈاکٹر نجم القادری صاحب نے 'امام احمد رضا اور تصور عشق رسول' کے حوالے سے خطاب کیا۔ اپنے اپنے موضوع پر ہر ایک کا خطاب پر مغز اور بصیرت افروز تھا۔ سامعین کی کثرت و محویت کا عالم بھی قابل دید تھا۔ ذہلی رات دو بجے یہ پروگرام اپنے اختتام کو پہنچا۔ اپنے موضوع، مواد، نوعیت اور اہمیت و افادیت کے اعتبار سے گلبرگہ کی تاریخ میں یہ پروگرام علمی و ادبی ہونے کے ساتھ ساتھ اصلاحی و موضوعی بھی تھا۔ اس عظیم الشان پروگرام کی کامیابی کا سہرا جناب جعفر بھائی اور دیگر اراکین رضا اکیڈمی کے سر جتا ہے۔

رپورٹ: محمد کاشف رضا: گلبرگہ شریف، کرناٹک

علامہ ارشد لاہیری کے زیر اہتمام اسلامی کونز مقابلہ

صوبہ جھارکھنڈ کی عظیم الشان علامہ ارشد لاہیری کے زیر اہتمام پہلی بار اسلامی کونز مقابلہ ۳ فروری ۲۰۰۸ء بروز اتوار ۹ ربیعہ صبح سے جگدیش پور میں منعقد ہوا جس کی صدارت مولانا محمد یسین احمد فیضی نے فرمائی اور نظامت کے فرائض حافظ سیاد عالم مصباحی نے ادا کیے، جبکہ قیادت مولانا محمد ثناء اللہ ازہر قادری ثقفی نے فرمائی۔ جس میں پچاس سے زائد علماء، ادباء اور ہزاروں کی تعداد میں باذوق حضرات نے شرکت کی۔

کونز مقابلہ کے لیے چھ عناوین قائم کیے گئے تھے۔ (۱) قرآن مقدس (۲) محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم (۳) ارکان اسلام (۴) فقہی مسائل (۵) حضرت علامہ ارشد القادری قدس سرہ کی حیات و خدمات (۶) جنرل نالج۔ مذکورہ عناوین پر طبع آزمائی کرنے کے لیے مدارس اسلامیہ کی چھ ٹیمیں شریک ہوئیں۔ جس کی تفصیل مقابلہ میں حاصل پوزیشن کے اعتبار سے نمبر وار درج ہے۔

(۱) مدرسہ نوریہ قادریہ دمکا (۲) مدرسہ سراج الاسلام مدھوپور (۳) مدرسہ دار القرآن آہر ڈیہہ گریڈ بیہ (۴) مدرسہ دینیہ اسلامیہ لال گڈھ، دیو گھر (۵) مدرسہ منظر العلوم سارتھ (۶) مدرسہ مندرمہ انوار العلوم اسہنا دیو گھر۔ مندرجہ بالا ٹیموں کو حاجی حسین انصاری سابق ایم ایل اے مدھوپور اور شہر کے دیگر دانشوروں کے ہاتھوں فرسٹ، سکنڈ، تھرڈ اور اعزازی انعامات سے نوازا گیا۔ ہر ایک راؤنڈ پر مجمع عام سے بھی سوالات پوچھے گئے۔ نتیجہ ہر ایک جواب پر انہیں بھی بہترین انعام دیا گیا۔ جس سے ہزاروں کی تعداد میں شرکاء خوب خوب محظوظ ہوئے اور کافی سراہا، اس قسم کا پروگرام سنہال پرگنہ کے لیے پہلا تجربہ تھا۔

بعد کونز ایک گھنٹہ کا پروگرام عوام الناس کے سوالات اور مفتی محمد صفی اللہ نوری کے جوابات کی شکل میں رکھا گیا جو بے حد دلچسپ اور مقبول رہا۔ واضح رہے کہ اس پروگرام کے انتظام و انصرام کے حوالے سے مولانا محمد امتیاز عالم فیضی جگدیش پور کا اہم رول رہا۔ کونز مقابلہ میں ابنائے فیض العلوم اور دیگر علماء نے بھی شرکت فرمائی۔

آخر میں مولانا محمد ازہر قادری ثقفی جنرل سکریٹری علامہ ارشد لاہیری نے تمام حاضرین اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور لاہیری کی

ضرورت اور اہمیت و افادیت لوگوں کے سامنے بیان کی۔ پھر صلاۃ و سلام کے بعد مولانا الحاج محمد شہادت حسین فیضی کی دعا پر رنج کر ۳۵ منٹ میں پروگرام کا اختتام ہوا۔

دپورٹ: محمد مختار عالم نوری، علامہ ارشد لاہیری، مدھوپور، جھارکھنڈ

جشن قرآن و پیغام امام حسین رضی اللہ عنہ

بتاریخ ۲۳ محرم الحرام ۱۴۲۹ھ مطابق ۳ فروری ۲۰۰۸ء بروز اتوار صبح ۱۰ بجے بڑے ترک و احتشام کے ساتھ جامعہ غوثیہ غریب نواز گھرانہ اندور کے وسیع و عریض صحن میں ایک روحانی محفل بنام ”جشن قرآن و پیغام امام حسین“ منعقد کی گئی، جس کی سرپرستی بحر العلوم حضرت مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ اعظمی نے فرمائی۔

اس محفل میں شہر اندور کے مختلف علاقوں اور دوسرے اضلاع سے ہمدردان قوم و ملت اور عاشقان امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شرکت فرمائی۔ قاری محمد اسلام الدین صاحب برکاتی (استاذ شعبہ قرأت جامعہ غوثیہ غریب نواز اندور) نے تلاوت قرآن کریم سے اس جشن کی ابتدا کی بعدہ پیر طریقت حضرت مولانا انوار احمد صاحب قبلہ قادری (بانی ادارہ ہذا) نے جامعہ کا مختصر تعارف عوام اہل سنت کے مابین پیش فرمایا۔

اس کے بعد حضرت الحاج محمد رضوان صاحب قبلہ رضوی (نائب امیر سنی دعوت اسلامی ممبئی) کی نعت و منقبت خوانی ہوئی۔ محقق مسائل جدیدہ حضرت مفتی محمد نظام الدین صاحب قبلہ رضوی نے لوگوں کے مسائل کا حل پیش کیا اور اپنی فقہی بصیرت کا جوہر دکھاتے ہوئے ہر سوال کا جواب بالذیل قرآن و حدیث کی روشنی میں عنایت فرمایا۔ آپ نے شیئر بازار کا خلاصہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی جتنی بھی پالیسیاں ہیں ان میں کہیں نہ کہیں سود کا عنصر ضرور ہے جو قطعی طور پر ناجائز و حرام ہے۔

آخر میں بحر العلوم حضرت مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ نے نصیحت آمیز تقریر فرمائی۔ ساتھ ہی آپ نے صاحب ادارہ کی عظیم کارکردگی کو سراہا اور دل کی اتھاہ گہرائیوں سے آپ کے لیے دعا فرمائی اور جامعہ کے انتظام و انصرام اور بہترین نظم و نسق کی بنا پر اساتذہ و ارکان جامعہ کو مبارکباد پیش کی۔ اس محفل کا اختتام سلام اور حضرت بحر العلوم کی دعائے نیک انجام سے ہوا۔ اس کے بعد لکڑ تقسیم کیا گیا۔

دپورٹ: رضی الدین احمد قادری، جامعہ غوثیہ غریب نواز، اندور

مَنْظُومِ شَا

ہٹ دھری، سرکشی اور فلک چومتا مزاج
کوئی کسی کی سننے کو تیار ہی نہیں
اوپچی عمارتوں کے تو بے شک ہیں سلسلے
آرام قلب سایہ دیوار ہی نہیں
ہے اعتراف جرم بڑے حوصلے کی بات
کرتا ہے روسیہ کبھی اقرار ہی نہیں
دیکھا زماں جہاں کو بہت ہی قریب سے
باقی مزید حسرت دیدار ہی نہیں

ڈاکٹر قمر الزماں

شمشیر نگر، پوسٹ ”بی“، پولی ٹیکنک، دھنباؤ (جھارکھنڈ)

دولت عشق سے تیرے جو تو نگر ہوگا
اُس کے قدموں پہ فدا بخت سکندر ہوگا
خاک طیبہ پہ گدا کا تیرے بستر ہوگا
کون سا روز وہ اے شافع محشر ہوگا
سامنے اس شہ خوباں کے یہ احقر ہوگا
قابل دید تماشا سر محشر ہوگا
کون ہو سکتا ہے خلقت میں خدا کی ایسا
جلوہ گر کرسی حق پر میرا سرور ہوگا
سر تسلیم اٹھاؤں گا نہ قدموں سے کبھی
جو کریں آپ میرے حق میں وہ بہتر ہوگا
سر میں ہرگز نہ اٹھاؤں گا تمہارے در سے
پھیرے جو آپ سے منہ وہ کوئی کافر ہوگا
اس کو گھر بیٹھے ہی مل جائے گی روزی فائق
جس کو دنیا میں تو کل کہ خدا پر ہوگا

سید محمد عثمان حسینی فائق (حیدرآباد)

شفیع روز جزا ہیں، کریم ایسے ہیں
مرے حضور رؤف و رحیم ایسے ہیں
ہر ایک حرف کے معنی ہیں آئینہ کی طرح
وہ نکتہ دان الم ایسے ہیں
پھر اس کے بعد نہ کوئی صدف نہ کوئی گہر
وہ بحر نور کے در یتیم ایسے ہیں
انظر کی سیدھ میں غلہ بریں کی منزل ہے
وہ رہنمائے رہ مستقیم ایسے ہیں
درائے عرش علی رب سے ہم کلام ہوئے
شہ دنیٰ فتدلی، کلیم ایسے ہیں
حضور باعث ایجاد کل جہاں ہیں شرر
حضور خلق خدا میں ”قدیم“ ایسے ہیں

ڈاکٹر فضل الرحمن شرر مصباحی

طیبہ کالج، پرنسپل کوشی، قردول باغ، نئی دہلی

باتیں طویل لذت گفتار ہی نہیں
جادو بیاں ہے، صاحب کردار ہی نہیں
ہے المیہ کہ کارگاہ کائنات میں
رکتا ہے تو دماغ کو بیدار ہی نہیں
کہنے کو یوں تو حلقہ احباب ہے وسیع
تسکین ہو تو کیا، کوئی دلدار ہی نہیں

ملکاتہ حیات نیور دہلی

پیراھن گل

رنگ، خوشبو، تازگی، پیراھن گل سا لکھوں
آمد فصل بہاراں تجھ کو میں کیا کیا لکھوں
تیرے نقش پا کو میں تشبیہ دوں کس چیز سے
پھول، شبنم، چاند یا اُدا ہوا دریا لکھوں

ایک اک لمحے پہ جیسے سبز منظر کا جہوم
آنکھ کی ٹھنڈک کہوں یا گنبد خضریٰ لکھوں

عہد ماضی کی طرف مڑ کر کبھی دیکھوں اگر
دور رفتہ کو مسلسل ظلم کا صحرا لکھوں

پہلے میں یکجا تو کر لوں کل جہاں کی ظلماتیں
تب کہیں کچھ واقعہ دور جہالت کا لکھوں

موسم گل کی حکایت آج پڑھنی ہے مجھے
تذکرہ دور خزاں کا کیوں عبث اتنا لکھوں

جل اٹھے ہیں دیپ خوشیوں کے ہزاروں بام پر
جگمگاتی رات کس کے حسن کا صدقہ لکھوں

ذرّہ بے نام بھی اوج ثریا تک گیا
تیرے دامن کی ہواؤں کا اسے جھونکا لکھوں

جی میں آیا آنے والی ذات کا خطبہ پڑھوں
مشورہ دل نے دیا مطلع میں یہ نکلوا لکھوں

زینت یسین لکھوں، زیبائش طہ لکھوں
صاحب معراج، سبحان الذی اسریٰ لکھوں

آمنہ کے گھر کا ہر ذرہ چراغ طور ہے
نازِ سدرہ، فخرِ قبلہ، رونقِ کعبہ لکھوں

درد امت کا رفیقِ زندگی بن کر رہا
کم ہے اس شانِ کرم پر جو لکھوں جتنا لکھوں

امر بالمعروف تیرے مسکرانے کا ہے نام
الاماں! نہی عن المنکر ترا غصہ لکھوں

تیری انگشت مبارک کے تعارف کے لئے
چاند شق ہونا لکھوں، اشجار کا جھکنا لکھوں

سر بسجود ہو گئے کعبہ کے بت کہتے ہوئے
وہ تو تھے جھوٹے خدا، تجھ کو نبی سچا لکھوں

یا رسول ہاشمی میلادِ رحمت کے طفیل
وہ نظر فرمائیے کہ خود کو میں اُجلا لکھوں

عالمِ اسلام پر چھائی ہے پھر کالی گھٹا
منتظر آنکھوں کا تیری سمت ہی اٹھنا لکھوں

چند جھونکے پھر مری فصلِ خزاں پر یا نبی ﷺ
تیری رحمت کو تیرے حسین کا صدقہ لکھوں

اک ضیاءِ روسیہ کیا سارے منکوں پر نظر
سارے دامن کا ترے دربار سے رشتہ لکھوں

مولانا سید محمد اشتیاق عالم ضیاء شہبازی
سجادہ نشین خانقاہ عالیہ شہبازی، بھاگلپور (بہار)

مکتبہ جام نور کی نئی مطبوعات

کوفیوں کی نوکستان کے بعد خارجیوں کے دشمن قلم پر



کربلا کا مسافر

Rs. 75/-

مرتبہ علامہ شتاق احمد نظامی

مقدمہ حضرت علامہ ارشد القادری رحمہ اللہ

پیش کش علامہ ارشد القادری کی تصانیف کی شخصیت اور شائستگی کے چند اہل اوراق



ارشاد کی کہانی

Rs. 25/-

ترتیب و ایڈیٹنگ خوشنور خان

اھلے ہرم کی وہ ریکھت اُنجڑ داستان
جو سیرف، اشکبار آنکھوں سے پھٹی جا سکتی ہے



کربلا کے خاکے

Rs. 80/-

ہجرت اعلیٰ امامہ افسانہ حسن ساہو

غزوات میں معجزات رسول ﷺ



غزوات الرسول ﷺ سیرت مصطفیٰ ﷺ کا ایک
نہایت ہی اہم اور درخشاں باب ہے۔ غزوات
رسول ﷺ اسلامی تاریخ کا وہ سنہری باب ہے
جس سے تاریخ اسلام درخشاں ہے اور صدیاں
گزرنے کے باوجود غزوات الرسول کی حرارت
مسلمانوں کے سینوں میں موجود ہے۔

Rs. 70/-

تالیف لطیف سید فیاض حسین شاہ (مدظلہ)

مکتبہ جام نور کی نئی زیر طبع کتابیں

- | | | | | |
|------------------|---------------------------------------|-----------------------|-------------------------------|-------------------|
| روبو | لالہ زار (ہندی) | تذکرۃ الاولیاء (ہندی) | ۵۵۵ کھانے (ہندی) | تجلی حکایت (ہندی) |
| معارف اسم محمد ﷺ | جدید عربی محاورات و تعبیرات | عقیدہ شفاعت | اختلافی مسائل پر تاریخی فتویٰ | |
| حدیث افتراق امت | احادیث قدسیہ | مشکل کش نمازیں | مصنف: مفتی عابد حسین مصباحی | |
| خطبات غوث الاعظم | سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ | رموز خطابت | مولانا نذیر الدین احمد | |
| رجال الغیب | پیرزادہ اقبال احمد فاروقی | تحفہ دہلن | حکیم محمد اسلم شاہین عطاری | |